جلد ۱۰۵ — اگست ۱۹۸۶ء — عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

اِسلامی انقلاب کا داعی :

دَورِ حاضر کا عظیم اِنسان

- جس نے نوجوانوں کو عزم وارادہ مہیا کیا
- جس نے مسلمانوں کو سمتِ منزل کا نشان دیا
- جس کا قلم ـــــ دریا کی روانی
- جس کا علم ـــــ بحرِ ذخّار
- جس کا جذبہ ـــــ طوفانوں کا رُخ متعین کرنے والا
- جس کی عزیمت ـــــ پہاڑوں کی طرح مستحکم

نوجوانوں کے لیے مثال ○ جوانمردوں کے لیے نمونہ ○ بوڑھوں کے لیے ہمدمِ دیرینہ

سیّد مودُودیؒ

بچپن ☼ جوانی ☼ بڑھاپا

اسعد گیلانی کے تحریکی قلم سے ـــ

ضخامت :

سائز : $\frac{23 \times 18}{8}$

زیرِ طبع ـــــــ

ادارہ
ترجمان القرآن
(پرائیویٹ) لمیٹڈ
رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۵ | اگست ۱۹۸۶ء مطابق ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ | عدد ۶

ماھنامہ ترجمان القرآن لاھور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرسالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اِس امرِ واقعہ پر مبارک باد کہ دستور کی نویں ترمیم (متعلق بہ نفاذِ شریعت) پاس ہوئی اور اب دوسرا مرحلہ شریعت بل کا ہے۔

میں اپنے واجب الاحترام بزرگوں کے متعلق یہ یقین رکھتا ہوں کہ وہ نفاذِ شریعت کے سلسلے میں کشمکش کی وسعتوں اور گہرائیوں کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن ہمارے کارکن بھائیوں کو بھی اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اس سلسلے میں بڑی جدوجہد درکار ہے اور بڑی بڑی مہماتِ مسلسل کی ضرورت ہے۔ نہ قراردادِ مقاصد پر ٹھہراؤ تھا، نہ دستور ۱۹۷۳ء کی اسلامی دفعات پر۔ نہ مارشل لاء کی اسلام نوازیوں پر، نہ دستور کی نویں ترمیم (بہ سلسلہ نفاذِ شریعت) کے پاس ہو جانے پر اور نہ اب سینیٹ میں زیرِ غور و بحث شریعت بل (پیش کردہ قاضی عبداللطیف اور مولانا سمیع الحق) کی منظوری پر۔

آپ میری باتوں سے مایوس ہونے کے بجائے صبر و عزیمت کے بلند تاریخی مقام پر کھڑے ہو کر حالات کو دیکھیں اور معاملات کو سوچیں۔

— ایک معرکہ دستوری و پارلیمانی سطح پر جاری ہے۔

— ایک محاذ "مسلمانانِ بلا اسلام" اور انحرافیوں اور جدیدیوں اور اجتہادیوں کا ہے، جو لادینیت پسندوں، کمیونسٹوں اور دین بیگانہ قوتوں کی پشت پناہی رکھتے ہیں۔ اور پھر اُن کے اوپر اہلِ مغرب اور سوشلزم کا سایہ ہے۔ یہ پارلیمانی سیاست میں بھی ہیں۔ یہ جلسوں میں بھی تقریریں فرماتے ہیں، یہ اخباروں میں بھی شریعت کے بارے میں انتشار پیدا کرنے اور اسلامی ریاست کے تصور کی گردن مغربی نظریات و ثقافت کے شکنجے میں کسوانے کے لیے بے چین ہیں، اور یہ اسلام کے حق میں ہر دستوری یا قانونی پیش قدمی کے خلاف — چاہے وہ کتنی معمولی درجے کی ہو —

اِس طرح کا زبانی اور تحریری پروپیگنڈا شروع کر دیتے ہیں کہ اسلام دستوری اور قانونی ذرائع سے نافذ ہونے کی چیز نہیں، جو لوگ نماز نہیں پڑھتے ان کو کوئی دستور نماز نہیں پڑھا سکتا۔ اور جو لوگ دین کے اصل منصوص دیوانی و فوجداری ضوابط سے آزاد اپنی روشِ معاملات رکھتے ہیں، اُن پر کبھی شریعت کا سایہ نہیں پڑ سکتا۔ یہ باتیں دراصل وہ اپنے متعلق کہنے کے ساتھ ساتھ ان کو برابر اس لیے پھیلا رہے ہیں کہ اور بھی زیادہ سے زیادہ لوگ اس پروگرام میں ان کے ہم نوا ہو جائیں کہ اسلام کے تقاضے اگر دستوری اور قانونی شکل میں سامنے آئیں تو اُن کو سرکشی اور بغاوت کی رو سے ڈائنا مائیٹ کر دینا ہے۔

قادیانیوں اور ان کے بعض ہم مزاج عناصر کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ ان کی پوری تخریبی مساعی یہ ہیں کہ اسلام اس شکل میں نافذ نہ ہو جائے جس میں اُن کے لیے اپنے عقیدوں کا فٹ کرنا مشکل ہو گا۔ کھلا کھاتہ چلتا رہے تو سب خیر رہنی ہے۔

آپ کے وڈیرے اور اس سے ساز باز رکھنے والی نوکر شاہی، نیز ان دونوں کے گٹھ جوڑ سے سرپرستی حاصل کرنے والا جرائم کا طبقہ اور اس تگڈم پر المضاعف وہ چوتھا "ضلع" جو کسی خانقاہ کی گدی یا مسجد کی چٹائی پر بیٹھ کر سر پر مسلط ارباب من دون اللہ کے حقوق کو خوب پہچانتا ہے یہ سب مل کر کتنی بڑی طاقت بنتے ہیں۔

میرے کارکن بھائی یہ ہے وہ عظیم محاذ جس سے ہمیں ہر جگہ سابقہ درپیش ہے۔

قبل اس کے کہ شریعت بل وغیرہ سے متعلق کوئی وضاحتی بات لکھوں، یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قرارداد مقاصد کے دور سے لے کر شریعت بل تک، جب بھی دین کی بات چلی تو ہمیں انتہائی زبردست سیلابِ مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سرکاری پارٹی کی طرف سے مختلف دفعات میں ایسی تبدیلیاں کر دینے کی کوششیں ہوئیں جن سے بات کچھ ڈھیلی ڈھالی ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ معاملات کو التوا میں ڈالا جا سکے، اسلام کے کسی قانون کے اجرا و نفاذ میں دس قسم کی دستوری و قانونی مزاحمتیں پیش آئیں۔ اور ان مزاحمتوں سے جب کوئی معاملہ گذرے تو جس حد تک ممکن ہو اس کا

حلیہ بگاڑ دیا جائے۔ یہ کوشش کہ ہر خرابی جو رائج ہے یا جو ہمارے اکابر یا طبقۂ غالب (مذکورہ بالا) کو پسند ہے، اُسے نہ چھیڑا جا سکے۔

ع کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

بلکہ دیوانہ صاحب کی خاکِ پا کو چوما جائے۔

تاہم اس ساری کوشش کو رائیگاں نہ سمجھا جائے، اس کا بہت بڑا فائدہ ہے جس کی مقدار فائدہ اُٹھانے والی قوت کی صلاحیت و محنت پر منحصر ہے۔ مثال یوں سمجھیے کہ کسی جگہ نماز کے لیے "قبلہ کے رُخ" کا نشان لگا ہے اور الفاظ لکھے ہیں، چٹائی بھی بچھی ہوئی ہے، یہ بورڈ بھی آویزاں ہے، کہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز پڑھے۔ اس طرح کے دستوری یا قانونی ماحول کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا کام کرنے والوں کے لیے راستے آسان ہو جاتے ہیں اور مخالفین نماز کو خود اُن کا سماجی و اخلاقی احساس کمزور کر دیتا ہے۔ اس میں مثبت کام کرنے والے اگر زور لگا کر تیزی سے کام کر جائیں تو "جدیدیت" اور "انحرافیہ" اور "اجتہادیہ" سب منقارِ زیرِ پَر ہو جائیں گے جیسے وہ قراردادِ مقاصد کے بعد چند سال کے لیے ہو گئے تھے۔ لیکن مثبت کام کرنے والوں نے کوتاہی کی تو منفی قوتیں پیشِ نظر کوشش کو زیادہ سے زیادہ غیر مؤثر بنا دیں گی۔

انہی آثار و علائم نے ایسی فضا بنائے رکھی ہے کہ ہمارے خوش حال، دانشور اور کھاتے پیتے طبقات کے ہزار دلی اضطراب کے باوجود قافلۂ ریاست کا رُخ نہیں بدلا جا سکا۔

کہنا یہ ہے کہ ماحول میں قدرے آسانی ہمارے لیے پیدا ہوئی ہے اور اتنی ہی مشکل مقابل کی قوتوں کے لیے بڑھی ہے۔

اس لمحے کو اپنے لیے ایک اچھا نقطۂ آغاز بنانا ہمارا اپنا کام ہے۔

اب آئیے ذرا اس ذہنی کشتی کا اندازہ کیجیے جو اس بل کے سلسلے میں پارلیمانی اسٹیڈیم میں ہو رہی ہے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک اصطلاح اور ایک ایک جملے اور پیرے پر آرا

کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آخر نویں ترمیمی بل کا تعلق بھی شریعت سے تھا، اس کے پاس ہونے کے بعد ایک نئے شریعت بل کی ضرورت کیا تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت بل کے اصل متن کا اساسی منشا یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ شریعت کے چھوٹے چھوٹے پرزے اور پارچے کبھی یہاں نمودار ہوں اور کبھی وہاں، کبھی اس پر کشمکش ہو کبھی اس پر، کوئی ایسی صورت ہونی چاہیے کہ پوری شریعت نافذ ہو، اور بیچ کے کسی ہیر پھیر اور ہیچ پیچ کے بغیر نافذ ہو۔

مگر حکومت نے سیاسی مہارت سے کام لے کر "مظاہرے" کے مصرعے پر دستور کی نویں ترمیم کو پاس کرنے کی گرہ لگائی، اور کچھ وقت کے لیے بے شمار لوگ اس مغالطے میں پڑ گئے کہ منزل ماری۔ یاد رہے کہ جس زمانے میں نویں ترمیم کا مسودہ زیر گفتگو تھا۔ اس زمانے میں بھی حکومتی جانب سے انتہائی کوششیں یہی کی گئیں کہ اصطلاحات کو زیادہ سے زیادہ ڈھیلا رکھا جائے، حتمی انداز سے بچا جائے، تشریح و توضیح کی وسیع گنجائشیں ہوں اور ہر مسئلہ چکروں میں سے گزرے۔ علاوہ ازیں وہ بل نہ صرف یہ کہ قرارداد مقاصد کی طرح عملی حکومت کاری کے لیے ڈھیلا ڈھالا تھا، بلکہ اس کی نوعیت ایک ایسے دستوری فیصلے کی تھی جس کا کوئی قانونی تقاضا نہیں تھا۔

بطور مثال نویں ترمیمی بل کے چند اجزا دیکھیے۔

اسلامی عناصر کی مانگ یہ تھی کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کو واضح طور پہ جامع اور بنیادی سرچشمہ قانون قرار دیا جائے اور کوئی قانون سازی قرآن و سنت کی تعلیمات سے ہٹ کر نہ ہو۔

جو دفعہ پاس ہوتی ہے ——— وہ کہتی ہے کہ مقدس قرآن و سنت بالاتر قوانین ہوں گے اور اسمبلیوں میں قانون سازی کے لیے اور حکومت کے پالیسی بنانے کے لیے "رہنمائی کا سرچشمہ" ہوں گے۔ ان الفاظ نے پوزیشن بدل دی ہے۔

جھگڑا اس بات پر تھا کہ قرآن و سنت ملک کا بالاتر قانون اور پالیسی کا سرچشمہ ہوں گے۔

اس بات کو" رہنمائی کا سرچشمہ" اور" ذریعہ ہدایت" میں بدل دیا گیا۔ یعنی پارلیمان کا کوئی فرد، وزیر اعظم یا پورا ایوان یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نے ہدایت اخذ کر لی ہے۔
اب ان الفاظ کو صحیح معنوں پر لانے کے لیے سیاسی قوت، اور سیاسی عمل یا دعوتی و اشاعتی سرگرمیوں کی ضرورت ہے۔

پھر ایک جھگڑا عائلی اور مالی قوانین کے قرآن و سنّت سے استثنیٰ پر تھا۔ درمیانی راہ یہ سامنے آئی کہ عائلی قوانین کے استثنیٰ کو حکومت نے چھوڑ دیا۔ اور ان قوانین کی فدائی خواتین اور ان کے ہم خیال دانشوروں کے لیے یہ گنجائش نکل آئی کہ وہ چاہیں تو ان قوانین کو یا ان کے کسی جز کو وفاقی شرعی عدالت میں لے جائیں۔ لیکن مالی قوانین جن کی اقسام کا دائرہ بہت وسیع بنتا ہے، ان کے لیے دلچسپ رُخ اختیار کیا۔ دستور کے ساتویں حصے، باب ۳ الف میں یہ ترمیم کی گئی کہ اگر کسی مالی معاملے کو عدالت کے سامنے اس دعوے کے ساتھ لے جایا جائے کہ یہ قرآن وسنّت کے خلاف ہے تو عدالت ضروری کارروائی کے بعد اس کا فیصلہ تو کرے گی۔ مگر اس کے ساتھ متبادل صورت طے کرے گی کہ مسئلے کا قانونی حل کیسے کیا جائے۔ پھر وہ متبادل صورت حکومت کو جائے گی اور عدالت ہی کی مقرر کردہ مدت میں وہ اس کے مطابق قانون یا پالیسی وغیرہ مقرر کرے گی اور جب تک یہ سلسلہ چلے گا، تمام کارروائیاں سابق چیلنج شدہ قانون کے مطابق ہی ہوتی رہیں گی۔ اور کوئی فیصلہ سابق طے شدہ اُمور پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

یعنی ہم جو یہ چاہتے تھے کہ قرآن وسنّت براہ راست قانون تسلیم کیے جائیں اور نافذ ہوں اور عدالتیں ان کے مطابق فیصلے کریں، یہ صورت حاصل نہ ہوسکی۔

پھر بھی نویں ترمیمی بل کا ایک بڑا فائدہ ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ سماعت بڑا وسیع ہوگیا ہے[1]۔ اب کلی استثنیٰ صرف دستور کو حاصل ہے۔ دوسرا استثنیٰ مالی مسائل و معاملات

---

[1] کسی رفیق کے لیے یہ سوال بڑا اہم ہوسکتا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار کو وسیع کرنے کا فائدہ کیا ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ پارلیمان میں اسپیکر اور حکومتی پارٹی کی اکثریت (باقی بر صفحہ آئندہ)

کے لیے ہے، جیسے ہم بیان کر چکے ہیں - یہ چیز معاشرے اور قوانین میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ان لوگوں کی مدد ہوگی جو کام کرنا چاہیں۔

البتہ اپنے سابق تمام قوانین کے لیے حکومتی پارٹی نے ایک خصوصی تحفظ حاصل کر لیا ہے۔ وہ یہی کہ جب تک کسی معاملے میں کسی قانون کو عدالت میں چیلنج نہ کیا جائے اور عدالت اس پر مخالفانہ مشورہ نہ دے دے اور پھر ماہرین کے مشورے سے اس کے لیے متبادل صورت تجویز کر کے حکومت کو ایک مقررہ میعاد میں عمل کرنے کے لیے نہ پہنچا دے۔ اس ساری کارروائی کے مکمل ہونے تک کوئی بھی مروجہ قانون کارفرما رہے گا۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان سارے مراحل کا سفر کیسے کیسے طویل ہو سکتا ہے اور پھر ان سفروں کا کیا علاج کہ سفر بھی ہوتے رہتے ہیں اور منزل بھی نہیں ملتی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اوّل تو مخالفین کو بولنے کے مواقع نہیں دیتی۔ جو مواقع ہوتے ہیں۔ ان میں بھی پوری بات دلائل کے ساتھ نہیں آسکتی۔ دلائل سے بڑھ کر ایوان میں جذباتی ماحول کا کبھی کبھی غلبہ ہو جاتا ہے۔ کبھی فیصلے پارٹیوں کی فتح و شکست کے جذبے سے ہوتے ہیں۔ اگر جابر اکثریت آجائے تو اپوزیشن کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں فیصلے ناقص ہوتے ہیں۔

بخلاف اس کے عدالت میں کسی بھی فریق کو پوری بات کرنے یا بیان پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ دلائل اور کتب حوالہ پیش کی جاتی ہیں۔ اسلامی قانون کے ماہرین اپنے علم کا ماحصل کسی مسئلے میں سامنے لاتے ہیں، عدالتوں کے فیصلے شائع ہوتے ہیں اور جج کو حکومت اور پبلک دونوں کی طرف سے چوکنا رہنا پڑتا ہے۔

پھر اگر غلطی سے کسی ایک معاملے میں غلط فیصلہ ہو بھی جائے تو اوّل تو دیر سویر اس کی تبدیلی ممکن ہوتی ہے، علاوہ ازیں ایک آدھ فیصلے کی غلطی کے معنی یہ نہیں کہ عدالت ساری شریعت کے جوڑ بند کھول دے۔

مولانا عبداللطیف اور مولینا سمیع الحق کے شرعی بل کو حکومتی پارٹی جوں کی توں قبول کرنے پر تیار نہیں اور شریعت کا راستہ روکنے کے لیے باہر سے بھی بہت سی قوتیں زور لگا رہی ہیں۔ کئی امور پر شرعی محاذ اور حکومتی پارٹی کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ جناب صدر نے بل کا مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل کو مطالعہ اور رائے کے لیے بھجوا دیا۔

اصل بل کی دفعہ ۴ یہ تھی کہ "پبلک کی عدالتیں تمام امور و مقدمات میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند رہیں گی" حکومتی نقطہ نظر یہ تھا کہ شرعی اور غیر شرعی ہونے کے معاملات صرف وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں رکھے جائیں۔ اور جب ضرورت ہو کوئی بھی معاملہ وفاقی شرعی عدالت کے سامنے لے جایا جا سکتا ہے۔ حکومتی حلقوں کا کہنا یہ ہے کہ تمام عدالتوں کو شریعت کے مطابق فیصلہ دینے کا اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ چھوٹی چھوٹی عدالتیں جگہ جگہ مختلف احکام دینے لگیں اور افراتفری پیدا ہو جائے۔ شرعی محاذ کا جواب یہ ہے کہ جب عام عدالتوں پر اعلیٰ عدالتیں موجود ہیں تو جیسے اب ان کو چوکنا رہ کر کام کرنا پڑتا ہے ویسا ہی محتاط رویہ وہ پھر بھی رکھیں گی۔ نیز اگر اتفاقاً دو عدالتیں اگر مختلف فیصلے دے دیتی ہیں تو پھر اُن پر وفاقی شرعی عدالت گرفت کر کے از سرِ نو صحیح فیصلہ کر سکتی ہے۔ ایسا تو شروع شروع میں شاذ و نادر رہو گا۔ بعد میں تو روایات و نظائر تشکیل پا جائیں گی۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے متبادل صورت یہ طے کی ہے کہ "ملک کی تمام عدالتیں تمام اُمور و مقاصد میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند رہیں گی اور شریعت کے خلاف فیصلوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔ اگر کسی عدالت میں یہ سوال اُٹھایا جائے گا کہ آیا کوئی قانون یا فیصلہ شریعت کے منافی ہے تو اس مسئلے کے فیصلے کے لیے وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کیا جائے گا۔"

یعنی نظریاتی کونسل نے اُصول تو وہی قبول کیا جو اصل بل میں ہے مگر عملی راستہ وہ اختیار کیا جو حکومتی حلقوں کو پسند ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے شریعت کی تعریف کی بحث کے متعلق بڑی حد تک مناسب راستہ نکالا ہے۔ اصل بل میں قانونِ شریعت کی تعریف میں یہ چیزیں بھی شامل تھیں کہ "کوئی حکم یا ضابطہ جو

اجماعِ اُمت سے ثابت اور ماخوذ ہو، شریعت کا حکم مقصود ہوگا۔ اور ایسے احکام جو اُمت کے مُسلّمہ اور مستند فقہاء (مجتہدین) نے قرآنِ پاک، سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماعِ اُمت کے قیاس واجتہاد کے ذریعے مستنبط کر کے مدوّن کیے ہوں، شریعت کے احکام متصور ہوں گے"۔ اس تعریف کی رُو سے گویا تمام دفاترِ فقہ کو تحفظ دے دیا گیا تھا۔ اور اس پر اسلام سے آزاد زندگیاں گذارنے والے "اجتہاد پسندوں" کے علاوہ ہمارے معزز اہلِ حدیث بھائیوں کو بھی سخت اختلاف تھا۔ حالانکہ ہم شریعت بل کی کامیابی اور غلبۂ اسلام میں ان کا تعاون چاہتے ہیں۔

نظریاتی کونسل نے یہ شکل تجویز کی۔

(اس ایکٹ میں) "شریعت سے مُراد قرآن وسنّت میں مذکورہ احکامِ اسلام ہیں"۔ توضیح: احکامِ اسلام کی تعبیر کے لیے مندرجہ ذیل مآخذ سے رہنمائی حاصل کی جائے گی۔ ۱۔ سنّتِ خلفائے راشدین۔ ۲۔ تعاملِ صحابہ۔ ۳۔ اجماعِ اُمت۔ ۴۔ مُسلّمہ فقہائے اسلام کی تشریحات وآرا۔

یہ صورت شریعت محاذ اور حکومتی حلقوں، دونوں میں قبولیت حاصل کر سکتی ہے۔

مزید نزاع یہ ہے کہ شریعت محاذ یہ کہتا ہے کہ حکومت کے انتظامی احکام کو بھی شریعت کا پابند ہونا چاہیے۔ اس کے لیے بل کے مسودہ کی دفعہ ۶ ملاحظہ ہو: "انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول صدرِ مملکت اور وزیراعظم شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا"۔

حکومتی حلقے اسے نہیں مانتے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے بطورِ مشورہ یہ عبارت تجویز کی ہے: "انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول صدرِ مملکت اور وزیراعظم شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا۔ اگر ایسا کوئی حکم دیا گیا تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور اسے وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا جائے گا بشرطیکہ شکایت کنندہ کے لیے کوئی قانونی مداوا نہ ہو"۔

پھر ایک اور نزاعی امر یہ ہے کہ اصل بل کہتا ہے کہ تمام عمّالِ حکومت کو بشمول صدر و وزیراعظم کسی کو عدالتی احتساب سے بالاتر قرار نہ دیا جائے۔ حکومتی حلقے اسے نہیں مانتے، کیونکہ وہ صدر کو تو کسی بھی صورت میں عدالت میں لانے پر تیار نہیں ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل کو اس سے اتفاق ہے۔

باقی کی دفعات اور شقوں میں بھی متنازعہ امور ہیں، لیکن نسبتاً کم اہم ہیں۔ ان کی بحث کو چھوڑتے ہیں کہ زیادہ تفصیل کا موقع نہیں۔

مختصر تاثر اس رسہ کشی سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ ایک فریق شریعت کو مؤثر اور جامع طور پر نافذ کرنا چاہتا ہے اور دوسرا فریق اس سلسلے کی پابندیوں سے زیادہ سے زیادہ ڈھیل حاصل کرنے اور بِل میں ایسے تعبیراتی قانونی رخنے بڑھانے کے لیے کوشاں ہے جو بچ نکلنے میں مدد دیں۔

معلوم نہیں کہ بالآخر کیا شکل طے پاتی ہے! — اور اس کا انحصار اس پر ہے کہ پمفلٹوں، اخباری بحثوں، جلسوں، قراردادوں اور ضرورت ہو تو مظاہروں کے ذریعے رائے عام کی تنظیم و تربیت کا کتنا کام کیا جاسکتا ہے اور اسلام کو "مسلمان کرم فرماؤں" کی چیرہ دستیوں سے کہاں تک بچایا جاسکتا ہے۔

حالات کا جو چیلنج ہمارے سامنے ہے وہ تقاضا کرتا ہے کہ ہماری توجہات کا سارا ارتکاز پارلیمانی جدوجہد پر ہی نہ ہو جائے، بلکہ دعوتِ عام، ملاقاتوں اور رابطوں، اخباری بحثوں، ادبی محاذوں، تنظیمی تجربوں، تحریکی اقدامات، ساری تدبیروں سے کام لیں۔ مجموعی کام کی وسعت، خود پارلیمانی محاذ کو بھی مضبوط اور مؤثر بناتی ہے۔

یہ حقیقت بڑی قابلِ توجہ ہے کہ مذہبی حلقوں کے اتحاد سے بار بار اچھے نتائج نمودار ہوتے ہیں۔ اِس وقت بھی شریعت بِل کے سلسلے میں متعدد جماعتوں کی مساعی ہم آہنگ ہیں — ہمارے دوسرے لاتعلق یا مخالف گروہوں کو بھی اندازہ ہو جانا چاہیے کہ لادینیت اور مادہ پرستی اور الحاد کا طوفان مغرب سے بھی اور شمال سے بھی ہماری طرف اُمڈا چلا آرہا ہے اور دونوں طرف کی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ جس طرح انہوں نے ہمارے بہت سے دانش ور مردوں اور عورتوں کو اپنی تقلید اور مرعوبیت سے رام کرکے اسلام کے خلاف لڑنے کے لیے آلۂ کار

بنا لیا ہے۔ اسی طرح وہ باقی ساری قوم پر بھی اپنے جال ڈال سکیں۔

ساتھ ہی اس کام کے لیے بھی یہاں کے اسلام گریز اور لادینیت پسند طبقے بھی اور باہر کے دشمن بھی یہ چاہتے ہیں کہ الحاد اور سیکولرازم کے مقابلے میں اسلامی محاذ کو اشخاص کی انانیت اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے ذریعے افتراق کا شکار بنا دیا جائے۔ ذہنیتیں یہاں تک اُلٹ جائیں کہ اہلِ دین مخالفینِ دین سے اتحاد کرتے نظر آئیں۔

ہماری آرزو ہے کہ قوم کے دینی حلقے آنکھوں کے سامنے پیش آنے والے حالات سے سبق سیکھیں۔ نیز ہمارے کارکن ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر رہ کر تمام دینی بزرگوں کی عزت بھی کریں، تمام دینی حلقوں سے ربط بھی رکھیں اور اُن تک پیغامِ اتحاد بھی پہنچائیں۔

یہ نہ سمجھیں کہ کام ہو گیا۔ کام ابھی باقی ہے اور مسلسل باقی رہے گا۔ تاآنکہ لادینیت کے خلاف معرکہ سر نہ کر لیا جائے۔ ورنہ لادینیت تو ان دستوری اور قانونی فیصلوں کو بھی سبوتاج کرنا چاہتی ہے، جنہیں نہایت محنت سے آپ تسلیم کراتے ہیں۔ ان دستوری اور قانونی فیصلوں کو موثر بنانا، ان میں عملاً اثر اندازی پیدا کرنا اور ان کے صحیح منشاء و مدعا کو حاصل کرنا بغیر اس کے ممکن ہی نہیں کہ آپ اُن کا پہرہ بھی دیں، ان کو اُن مخالفین سے بھی بچائیں جو ان کا حلیہ بگاڑنے پر پہلے سے تُلے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر معانی بھی پیدا کریں، ان کے اندر زور و قوت بھی بھر دیں۔ اور ان کو کھوکھلے لفظوں کے بجائے ٹھوس اور عملی اور چلتی پھرتی حقیقتیں بنا دیں۔

خدا اپنی راہ میں آپ کا حامی و ناصر ہو!

حکمتِ سیّد مودودیؒ

حج کے متعلق چند قرآنی لمعات

(مرتبہ مدیر)

میں نے خصوصی توجہ سے حج کے متعلق تفہیم القرآن سے بیشتر نوٹ جمع کیے ہیں، جن سے حج کے بارے میں کئی حقائق واضح ہو جاتے ہیں۔ دو چار اجزا میں نے چھوڑ دیے ہیں، بعد میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ حوالے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔ (مدیر)

حج و عمرہ ایک ساتھ عرب جاہلیت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ کرنا گناہ عظیم ہے۔ اُن کی خود ساختہ شریعت میں عمرے کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے (سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۶ کے مطابق) اس قید کو اڑا دیا اور باہر سے آنے والوں کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج دونوں کر لیں، البتہ جو لوگ مکہ کے آس پاس میقاتوں کی حدود کے اندر رہتے ہوں، انہیں اس رعایت سے مستثنیٰ کر دیا، کیونکہ اُن کے لیے عمرے کا سفر الگ اور حج کا سفر الگ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ (۱)

احرام کی چند پابندیاں احرام کی حالت میں میاں اور بیوی کے درمیان نہ صرف تعلقِ زن و شو ممنوع ہے، بلکہ ان کے درمیان کوئی ایسی گفتگو بھی نہ ہونی چاہیے جو رغبتِ شہوانی پر مبنی ہو۔

تمام معصیت کے افعال اگرچہ بجائے خود ناجائز ہیں، لیکن احرام کی حالت میں ان کا

گناہ بہت سخت ہے۔
حتیٰ کہ خادم کو ڈانٹنا تک جائز نہیں۔②

حج، زادِ راہ اور تقویٰ جاہلیت کے زمانے میں حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دُنیا دارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دُنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت (البقرہ-۱۹۷) میں ان کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ زادِ راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے۔ جو مسافر اپنے اخلاق درست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر بُرے اعمال کرتا ہے، وہ اگر زادِ راہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں فقیری کی نمائش کرتا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں خدا اور خلق دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہوگا۔ اور اپنے اس مذہبی کام کی بھی وہ توہین کرے گا جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے، لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے اخلاق درست ہوں تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزت ہوگی اور خلق بھی اس کا احترام کرے گی، چاہے اس کا توشہ دان کھانے سے بھرا ہوا ہو۔③

سفرِ حج اور کسبِ معاش یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصور تھا کہ سفرِ حج کے دوران میں کسبِ معاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کسبِ معاش ایک دُنیا دارانہ فعل تھا۔ اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ ایک خداپرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور کوئی گناہ نہیں، اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے۔④

حج میں قریش کی شانِ امتیاز حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے زمانے میں عرب کا معروف طریقِ حج یہ تھا کہ ۹ ذوالحجہ کو مکہ سے عرفات جاتے تھے اور ۱۰ ذوالحجہ کی صبح کو وہاں سے پلٹ کر مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، مگر بعد کے زمانے میں جب رفتہ رفتہ قریش کی برہمنیت قائم

ہو گئی تو انھوں نے کہا: ہم اہلِ حرم ہیں، ہمارے مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ عام اہلِ عرب کے ساتھ عرفات تک جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کی کہ مزدلفہ تک جا کر ہی پلٹ آنے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہی امتیاز بنی خزاعہ اور بنی کنانہ اور ان کے دوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہو گیا، جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے رشتے تھے۔ آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے اُن کی شان بھی عام عربوں سے اُونچی ہو گئی اور انھوں نے بھی عرفات جانا چھوڑ دیا۔ اِسی فخر و غرور کا بُت اس آیت (البقرہ ۱۹۹) میں توڑا گیا ہے۔ آیت کا خطاب خاص قریش اور ان کے رشتہ دار اور حلیف قبائل کی طرف ہے۔ اور خطابِ عام ان سب کی طرف ہے جو آئندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ اُن کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں انھیں کے ساتھ جاؤ، انھیں کے ساتھ ٹھیرو، انھیں کے ساتھ پلٹو اور اب تک جاہلیت کے فخر و غرور کی بنا پر سنّتِ ابراہیمیؑ کی جو خلاف ورزی کرتے رہے ہو اُس پر اللہ سے معافی مانگو۔ (۵)

ذکرِ آبا کے بجائے ذکرِ خدا

اہلِ عرب حج سے فارغ ہو کر جلسے کرتے تھے جن میں ہر قبیلے کے لوگ باپ دادا کے کارنامے فخر سے بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے (البقرہ ۲۰۰) کہ ان جاہلانہ باتوں کو چھوڑو۔ پہلے جو وقت فضولیات میں صرف کرتے تھے اب اُسے اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں صرف کرو۔ (۶)

دارالامن

فتح مکّہ کے دوسرے روز جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا اُس میں آپؐ نے اعلان فرما دیا تھا کہ "لوگو! اللہ نے مکّہ کو ابتدائے آفرینش سے حرام کیا ہے اور یہ قیامت تک کے لیے اللہ کی حرمت سے حرام ہے۔ کسی شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، حلال نہیں ہے کہ یہاں کوئی خون بہائے"۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اگر میری اس جنگ کو دلیل بنا کر کوئی شخص اپنے لیے یہاں خونریزی کو جائز ٹھیرائے تو اس سے کہو کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کے لیے اس کو جائز کیا تھا نہ کہ تمھارے لیے۔ اور میرے لیے بھی یہ صرف ایک دن کی ایک ساعت کے لیے حلال کیا گیا تھا۔ پھر آج اس کی حرمت

اسی طرح قائم ہو گئی جیسی کل تھی"۔

حرم کے باہر جس شخص نے کسی کو قتل کیا ہو یا کوئی اور ایسا جرم کیا ہو جس پر حد لازم آتی ہو اور پھر وہ حرم میں پناہ لے لے تو جب تک وہ وہاں رہے اُس پر ہاتھ نہ ڈالا جائے گا۔ حرم کی یہ حیثیت حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آتی تھی۔ اور فتح مکہ کے روز صرف ایک ساعت کے لیے اُٹھائی گئی۔ پھر ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئی۔ قرآن کا ارشاد ہے وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا "جو اس میں داخل ہو گیا، امن میں آگیا"۔ حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے یہ اقوال معتبر روایات میں آتے ہیں کہ ہم اپنے باپ کے قاتل کو بھی وہاں پائیں تو اُسے ہاتھ نہ لگائیں۔ اسی لیے جمہور تابعین اور حنفیہ اور حنابلہ اور اہل حدیث اس کے قائل ہیں کہ حرم کے باہر کیے ہوئے جُرم کا قصاص حرم میں نہ لیا جائے گا۔

وہاں کے قدرتی درختوں کو نہیں کاٹا جا سکتا، نہ خود رَو گھاس اُکھاڑی جا سکتی ہے، نہ پرندوں اور دوسرے جانوروں کا شکار کیا جا سکتا ہے اور نہ شکار کی غرض سے وہاں کے جانور کو بھگایا جا سکتا ہے تاکہ حرم کے باہر اس کا شکار کیا جائے۔ اس سے صرف سانپ بچھو اور دوسرے جانور مستثنیٰ ہیں اور خود رَو گھاس اِذخر اور خشک گھاس مستثنیٰ ہے۔

وہاں کی گری پڑی چیز اُٹھانا ممنوع ہے ـــــ وہاں جو شخص بھی حج یا عمرے کی نیت سے آئے وہ احرام کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔(۷) (اختلافات ساقط کر دیے۔ مرتب)

حج کے دُنیوی فوائد

اس (یعنی یہ ارشاد باری تعالیٰ کہ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ) سے مُراد صرف دینی فائدے ہی نہیں بلکہ دُنیوی فائدے بھی ہیں۔ یہ اسی خانہ کعبہ اور اس کے حج کی برکت تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک ڈھائی ہزار سال کی مدت میں عربوں کو ایک مرکزِ وحدت حاصل رہا جس نے ان کی عربیت کو قبائلیت میں بالکل گم ہو جانے سے بچائے رکھا۔ اسی مرکز سے وابستہ ہونے اور حج کے لیے ہر سال مُلک کے تمام حصّوں سے آتے رہنے کی بدولت ان کی زبان ایک رہی، تہذیب ایک رہی، ان کے اندر عرب ہونے کا احساس باقی رہا، اور اُن کو خیالات، معلومات اور تمدنی طریقوں کی اشاعت کے مواقع ملتے رہے۔ پھر یہ بھی اسی حج کی برکت تھی کہ عرب کی اس

عام بدامنی میں کم از کم چار مہینے ایسے امن کے میسر آجاتے تھے جن میں ملک کے ہر حصّے کا آدمی سفر کرسکتا تھا اور تجارتی قافلے بھی بخیریت گزر سکتے تھے۔ اس لیے عرب کی معاشی زندگی کے لیے بھی حج ایک رحمت تھا۔ اسلام کے بعد حج کے دینی فائدوں کے ساتھ اس کے دنیوی فائدے بھی کئی گنے زیادہ ہوگئے۔ پہلے وہ صرف عرب کے لیے رحمت تھا، اب وہ ساری دنیا کے اہلِ توحید کے لیے رحمت ہوگیا۔ ⑧

قربانی (سورۂ حج کی آیت ۲۸ میں) جانوروں سے مراد مویشی جانور ہیں، یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری جیسا کہ سورۂ انعام رکوع ۱۷ میں بصراحت بیان ہوا ہے۔

اُن پر اللہ کا نام لینے سے مراد، اللہ کے نام پر اور اس کا نام لے کر انہیں ذبح کرنا ہے۔ قرآن مجید میں قربانی کے لیے بالعموم "جانور پر اللہ کا نام لینے" کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد اللہ کے نام پر جانور کو ذبح کرنا ہی ہے۔ اس طرح گویا اس حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ کا نام لیے بغیر، یا اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر جانور کو ذبح کرنا کفار و مشرکین کا طریقہ ہے۔ ⑨

احرام کھولنا مناسکِ حج سے فارغ ہو کر احرام کھول دیں (بروئے آیت سورہ حج ۲۹) حجامت کرائیں، نہائیں، دھوئیں اور وہ پابندیاں ختم کر دیں جو احرام کی حالت میں عاید ہوگئی تھیں۔ لغت میں تَفَث کے اصل معنی اُس غبار اور میل کچیل کے ہیں جو سفر میں آدمی پر چڑھ جاتے ہیں، مگر حج کے سلسلے میں جب میل کچیل کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا مطلب وہی لیا جائے گا جو اُوپر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ حاجی جب تک مناسکِ حج اور قربانی سے فارغ نہ ہو جائے، وہ نہ بال ترشوا سکتا ہے، نہ ناخن کٹوا سکتا ہے اور نہ جسم کی دوسری صفائی کرسکتا ہے۔ ⑩

قربانی کا گوشت کس کس کو دیا جائے "تنگ دست فقیر (واطعموا البائس الفقیر) کو (قربانی کا گوشت۔ مرتب) کھلانے کے متعلق جو فرمایا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غنی کو نہیں کھلایا جاسکتا۔ دوست، ہمسائے، رشتہ دار، خواہ محتاج ہوں نہ ہوں، پھر بھی انہیں قربانی کے گوشت میں سے دینا جائز ہے۔ یہ بات صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہے۔ علقمہؒ کا

بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے میرے ہاتھ قربانی کے جانور بھیجے اور ہدایت فرمائی کہ یوم النحر کو انہیں ذبح کرنا، خود بھی کھانا، مساکین کو بھی دینا اور میرے بھائی کے گھر بھی بھیجنا۔ ابن عمرؓ کا بھی یہی قول ہے کہ ایک حصہ کھاؤ، ایک حصہ ہمسایوں کو دو اور ایک حصہ مساکین میں تقسیم کرو۔ (۱۱)

تعظیم شعائر اللہ اور ہدی کے جانور (شعائر اللہ سے مراد ہیں) ۔ خدا پرستی کی علامات، خواہ وہ اعمال ہوں جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ یا اشیا ہوں جیسے مسجد اور ہدی کے اونٹ وغیرہ۔

یہ احترام (شعائر اللہ کا) دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کے دل میں کچھ نہ کچھ خدا کا خوف ہے، جبھی تو وہ اس کے شعائر کا احترام کر رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی شخص جان بوجھ کر شعائر اللہ کی ہتک کرے تو یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس کا دل خدا کے خوف سے خالی ہو چکا ہے یا تو وہ خدا کا قائل ہی نہیں ہے، یا ہے تو اس کے مقابلے میں باغیانہ روش اختیار کرنے پر اُتر آیا ہے۔

پہلی آیت میں شعائر اللہ کے احترام کا عام حکم دینے اور اسے دل کے تقویٰ کی علامت ٹھیرانے کے بعد یہ فقرہ (لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى) ایک غلط فہمی رفع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ شعائر اللہ میں ہدی کے جانور بھی داخل ہیں۔ جیسا کہ اہل عرب مانتے تھے اور قرآن خود بھی آگے چل کر کہتا ہے کہ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ۔ (اور ان ہدی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے۔)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کا جو حکم اوپر دیا گیا ہے، کیا اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہدی کے جانوروں کو جب بیت اللہ کی طرف لے جانے لگیں تو ان کو کسی طرح بھی استعمال نہ کیا جائے، ان پر سواری کرنا، یا سامان لادنا، یا ان کے دودھ پینا تعظیم شعائر اللہ کے خلاف تو نہیں۔ عرب کے لوگوں کا یہی خیال تھا۔ چنانچہ وہ ان جانوروں کو بالکل کوتل لے جاتے تھے۔ راستے میں ان سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ اسی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قربانی کی جگہ پہنچنے تک تم ان جانوروں سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔

ایسا کرنا تعظیمِ شعائر کے خلاف نہیں ہے۔

یہی بات ان احادیث سے معلوم ہوتی ہے، جو اس معاملے میں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ ان میں بیان ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ کی مہار تھامے پیدل چل رہا ہے۔ اور سخت تکلیف میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اس پر سوار ہو جا۔ اس نے عرض کیا! یہ ہدی کا اونٹ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ارے سوار ہو جا۔ (۱۲)

(اس معاملے میں مفسرین اور فقہاء کے اختلافات کا خلاصہ ساقط کر دیا گیا ہے۔ مرتب)

قربانی تمام اُمتوں میں رہی ہے

اس آیت سے (وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا ......الخ) سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ قربانی تمام شرائع الٰہیہ کے نظامِ عبادت کا ایک لازمی جزء رہی ہے۔ توحید فی العبادات کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان نے جن جن صورتوں سے غیر اللہ کی بندگی کی ہے، ان سب کو غیر اللہ کے لیے ممنوع کر کے صرف اللہ کے لیے مختص کر دیا جائے۔ مثلاً انسان نے غیر اللہ کے آگے مالی نذرانے پیش کیے۔ شرائع الٰہیہ نے انھیں ممنوع کر کے زکوٰۃ و صدقہ اللہ کے لیے واجب کر دیا۔ انسان نے معبودانِ باطل کی تیرتھ یاترا کی، شرائع الٰہیہ نے کسی نہ کسی مقام کو مقدس یا بیت اللہ قرار دے کر اس کی زیارت و طواف کا حکم دے دیا۔ انسان نے غیر اللہ کے نام کے روزے رکھے ہیں، شرائع الٰہیہ نے انھیں بھی اللہ کے لیے مختص کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح انسان اپنے خود ساختہ معبودوں کے لیے جانوروں کی قربانیاں بھی کرتا رہا ہے، اور شرائع الٰہیہ نے ان کو بھی غیر کے لیے قطعاً حرام اور اللہ کے لیے واجب کر دیا۔

دوسری بات اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوئی کہ اصل چیز اللہ کے نام پر قربانی ہے، نہ کہ اس قاعدے کی یہ تفصیلات کہ قربانی کب کی جائے۔ اور کہاں کی جائے اور کس طرح کی جائے۔ ان تفصیلات میں مختلف زمانوں اور مختلف قوموں اور ملکوں کے انبیاء کی شریعتوں میں حالات کے لحاظ سے اختلافات رہے ہیں، مگر سب کی روح اور سب کا مقصد ایک ہی رہا ہے۔ (۱۳)

قربانی کی معنویت اور اس کا عمومی وجوب

یعنی (مطالبہ ہے کہ) دل اس کی (اللہ کی) بڑائی مانو

اور عمل سے اُس کا اعلان و اظہار کرو۔ پھر یہ حکم قربانی کی غرض اور علت کی طرف اشارہ ہے۔
قربانی صرف اس لیے واجب نہیں کی گئی کہ یہ تسخیر حیوانات پر اللہ کا شکریہ ہے۔
بلکہ اس لیے بھی واجب کی گئی ہے کہ جس کے یہ جانور ہیں اور جس نے انہیں ہمارے لیے
مسخر کیا ہے، اس کے مالکانہ حقوق کا ہم دل سے بھی اور عملاً بھی اعتراف کریں تاکہ ہمیں
کبھی یہ مغالطہ نہ لاحق ہو جائے کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا مال ہے۔ اسی مضمون کو وہ فقرہ ادا کرتا
ہے کہ اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ۔

اس مقام پر یہ جان لینا چاہیے کہ اس پیراگراف میں قربانی کا جو حکم دیا گیا ہے وہ صرف حاجیوں
کے لیے ہی نہیں ہے اور صرف مکہ میں حج ہی کے موقع پر ادا کرنے کے لیے نہیں بلکہ تمام
ذی استطاعت مسلمانوں کے لیے عام ہے، جہاں بھی وہ ہوں تاکہ وہ تسخیر حیوانات
کی نعمت پر شکریہ اور تکبیر کا فرض بھی ادا کریں اور ساتھ ساتھ اپنے اپنے مقامات پر حاجیوں
کے شریک حال بھی ہو جائیں۔ حج کی سعادت میسر نہ آئی نہ سہی، کم از کم حج کے دنوں میں ساری
دنیا کے مسلمانوں کا وہ کام تو کر رہے ہیں جو حاجی جوار بیت اللہ میں کریں۔ اس مضمون کی
تصریح متعدد صحیح احادیث میں وارد ہوئی ہے اور بکثرت معتبر روایات سے بھی ثابت ہوا
ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ طیبہ کے پورے زمانہ قیام میں ہر سال بقرعید کے موقع
پر قربانی کرتے رہے اور مسلمانوں میں آپ ہی کی سنت سے یہ طریقہ جاری ہوا۔ [۱۴] (احادیث اور
فقہ کے نکات شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ مرتب)

حوالہ جات

۱۔ تفہیم القرآن، جلد ۱، حاشیہ نمبر ۲۱۳

۲۔	″	″ ۱	″	۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶
۳۔	″	″ ۱	″	۲۱۷
۴۔	″	″ ۱	″	۲۱۸
۵۔	″	″ ۱	″	۲۲۰

۶—	تفہیم القرآن،	جلد ۱،	حاشیہ نمبر ۲۲۱		
۷—	"	"	" ۳	"	۴۴ ترتیب میں تبدیلی کی گئی (مرتب)
۸—	"	"	" ۳	"	۴۸
۹—	"	"	" ۳	"	۴۹
۱۰—	"	"	" ۳	"	۵۱
۱۱—	"	"	" ۳	"	۵۰
۱۲—	"	"	" ۳	"	۶۰، ۶۱، ۶۲
۱۳—	"	"	" ۳	"	۶۴
۱۴—	"	"	" ۳	"	۷۴

امام بخاریؒ اور ان کی علمی خدمات

ملک عبدالرشید عراقی صاحب

محدثین کرام کی جماعت میں امام بخاریؒ کو جو خصوصیت اور امتیاز حاصل ہے اس سے کون واقف نہیں۔ امام بخاری نے جس ذوق اور شوق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع کیا۔ اس سے بھی اہلِ علم شناسا ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی، آسائش اور عافیت سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر قربان کر دیا اور اس کا جو صلۂ عظیم ان کو قیامت کے دن ملے گا وہ تو یقیناً ملے گا، اس فانی دُنیا میں بھی وہ امام المحدثین اور امیرالمومنین فی الحدیث کے لقب سے ملقب ہوئے اور ان کی پرکھی ہوئی حدیثوں اور جانچے ہوئے راویوں پر کمال درجۂ اعتماد کیا گیا۔ اور ان کی مشہور کتاب الجامع الصحیح کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا خطاب دیا گیا۔

انہوں نے جفاکشی، محنت، علوہمتی، استغنا، حزم واحتیاط، صدق ودیانت وتقویٰ، عدل وانصاف، خدمتِ خلق اور اشاعتِ علوم کی مجسم تصویر بن کر ایک عالم کے لیے نمونہ قائم کیا۔ اس کے علاوہ فقہ الحدیث کی آپ نے جو خدمت کی اس کا اہلِ علم واصحاب سیر نے اعتراف کیا ہے۔

امام بخاریؒ کی علمی خدمات پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کے حالاتِ زندگی تحصیلِ علم، قوتِ حافظہ، اخلاق وعادات، فضائل ومناقب اور علمی تبحر کے بارے میں معاصرین کی آرا وغیرہ کا مختصراً ذکر دیا جائے۔

نام ونسب سلسلۂ نسب یہ ہے۔ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ جعفی۔[۱]

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ امام بخاری کے دادا ابراہیم بن مغیرہ کے حالات پردۂ اخفاء میں ہیں، لیکن آپ کے والد اسمٰعیل بن ابراہیم اپنے زمانے میں چوتھے طبقہ کے محدثین میں شمار ہوتے تھے۔ امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) اور حماد بن زید (م ۱۳۰ھ) کے شاگرد تھے۔ اور محدث عبداللہؒ بن مبارک (م ۱۸۱ھ) کی صحبت میں مدتوں رہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب تاریخ کبیر میں امام عبداللہؒ بن مبارک کے حالات لکھے ہیں۔ اور اپنے والد کے فضل وکمال پر فخر کیا ہے۔[۲]

پیدائش اور ابتدائی حالات امام بخاریؒ ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والد اسمٰعیل بن ابراہیم انتقال کر گئے اور آپ کو بچپن ہی میں یتیمی کا داغ دیکھنا پڑا۔ ابھی آپ چھوٹے ہی تھے کہ آپ کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ علاج معالجہ ہوتا رہا، مگر آپ کی بصارت ٹھیک نہ ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ بڑی عابدہ اور باکرامت خاتون تھیں۔ ان کا اکثر وقت رونے اور دعا کرنے میں گذرتا تھا۔ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دیکھا۔ وہ فرمارہے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے تمہارے رونے اور دعا کرنے سے تمہارے بیٹے کی آنکھیں درست کردی ہیں۔[۳]

ابتدائی تعلیم میں علم فقہ پر خصوصی توجہ کی۔ اور امام وکیع (م ۱۹۷ھ) اور امام عبداللہ بن مبارک (م ۱۹۴ھ) جیسے اساتذۂ فن کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ اور ۱۵ برس کی عمر میں فقہ کی تعلیم سے

---

[۱] مغیرہ مجوسی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ حاکم بخارا یمان جعفی کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اس لیے ان کے ساتھ ولاء کی نسبت سے جعفی کہلائے، ورنہ بنو جعف سے ان کا کوئی نسبی تعلق نہیں تھا۔ (تہذیب التہذیب لابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) جلد ۸ ص ۱۵۰۔

[۲] ہدیۃ الساری مقدمہ فتح الباری لابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) ص ۴۷۸۔

[۳] ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۴۵۸۔

فارغ ہوگئے۔ فقہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد علمِ حدیث کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۶ سال تھی۔

اساتذہ و شیوخ امام بخاریؒ نے ابتدا میں محمد بن سلام بیکندی (م ۲۲۵ھ) عبداللہ بن محمد مسندی (م ۲۲۹ھ) سے تعلیم حاصل کی۔ لیکن آپ نے سب سے زیادہ اکتساب امام اسحاق بن راہویہ (م ۲۳۸ھ) اور امام علی بن مدینی (م ۲۳۴ھ) سے کیا۔ امام صاحب کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ علامہ قسطلانی (م ۹۲۹ھ) نے آپ کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

كتبت عن الف وثمانين نفسا ليس فيهم الا صاحب الحديث[1]

میں نے ایک ہزار اسی (۱۰۸۰) اساتذہ سے حدیث لکھی ہے۔ یہ سب کے سب محدث تھے۔

تلامذہ امام بخاری کے تلامذہ کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا۔ ان کے ایک شاگرد امام محمد بن یوسف فریری (م ۳۲۰ھ) کا بیان ہے کہ:

"امام صاحب سے براہ راست ۹۰ ہزار آدمیوں نے جامع صحیح کو سنا۔[2]

امام صاحب کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں جلیل القدر محدثین کرام کے نام آتے ہیں۔ امام مسلم بن حجاج صاحب صحیح مسلم (م ۲۶۱ھ)، امام ابو عیسیٰ ترمذی صاحب جامع الترمذی (م ۲۷۹ھ)، امام ابو عبدالرحمٰن نسائی صاحب سنن نسائی (م ۳۰۳ھ)، امام محمد بن یوسف فریری (م ۳۲۰ھ)، امام ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن صاحب سنن دارمی (م ۲۵۵ھ)، امام الحافظ صالح بن محمد جزرۃ (م ۲۹۳ھ)، امام محمد بن نصر مروزی (م ۲۹۴ھ)، امام ابو حاتم رازی (م ۲۷۷ھ)، امام ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ)، امام ابوزرعہ (م ۲۸۱ھ)، امام ابو بکر

[1] ارشاد الساری ص ۳۱
[2] ایضاً ص ۳۳

بن ابی عاصم الحافظ الکبیر (م ۲۸۷ھ)۔[1]

غیر معمولی قوتِ حافظہ امام بخاری فطرۃً نہایت قوی الحافظہ تھے۔ فطرت کی اس فیاضی سے انہوں نے فنِ حدیث کی تحصیل میں بہت فائدہ اٹھایا۔ استاد سے جو حدیث سنتے وہ فوراً سینہ پر نقش ہو جاتی۔ خود فرماتے تھے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں۔ اور میں نے جامع صحیح کو ۶ لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے[2]۔ آپ کے حافظہ کے بارے میں بغداد کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک سو احادیث کو متن اور سندوں سے بدل کر آپ کے سامنے پڑھا گیا۔ مگر آپ نے ہر متن کو اس کی اصلی سند اور ہر سند کو اس کے اصلی متن کے ساتھ ملحق کر کے ترتیب وار سنا دیا۔ لوگ سن کر دنگ رہ گئے۔ اور انہیں آپ کے علم وفضل اور قوتِ حافظہ کو بے مثل تسلیم کرنا پڑا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ جو احادیث انہوں نے غلط متن اور غلط سند کے ساتھ پڑھی تھیں، وہ بھی امام صاحب کو یاد ہو گئیں[3]۔

امام صاحب کے علم وفضل کی شہرت امام صاحب کے فضل وکمال اور علمی تبحر کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ بڑے بڑے محدثین کرام آپ کے علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، علل حدیث، تاریخ، لغت، اسماء الرجال، فقہ، اصولِ فقہ، انساب، لغت، معانی، اور صرف ونحو میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علل حدیث کا علم جس کے بارے میں محدثین کرام بالاتفاق کہتے ہیں کہ یہ علم نہایت گہرا، مشکل اور انتہائی معزز ہے۔ اس فن میں کلام کرنے کی قدرت صرف انہیں محدثین کو حاصل تھی، جن کی سوجھ بوجھ تابناک تھی، جنہیں قوتِ حافظہ میں کمال تھا اور جن کو گہری بصیرت حاصل تھی۔ اور ان سارے پہلوؤں سے امام بخاری بڑے بلند مرتبت تھے[4]۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی (م ۷۴۸ھ)

۲ مقدمہ ارشاد الساری ص ۲۹۰

۳ ہادی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۵۷۳

۴ ایضاً ایضاً ص ۱۲

امام صاحب کے علمی تبحر سے متعلق شیوخ و معاصرین کا اعتراف

امام صاحب کے علمی تبحر، وسعتِ معلومات اور معرفت حدیث کے بارے میں علمائے کرام کہا کرتے ہیں۔

انما ھو آیة من ایات اللہ تمشی علی وجه الارض ما خلقه اللہ الا للحدیث[1]

امام بخاری خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں جو زمین پر چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو صرف حدیث ہی کے لیے پیدا کیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ امام صاحب کی مدح و ستائش میں اگر متاخرین کے اقوال نقل کیے جائیں تو کاغذ اور روشنائی ختم ہو جائے۔

فذالك البحر لا ساحل له

ع سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

خراسان کی سرزمین میں محمد بن اسمٰعیل جیسا شخص پیدا نہیں ہوا۔[2]

علامہ بدر الدین عینی حنفی (م ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں:

الحافظ الحفیظ الشھیر، الممیز، الناقد البصیر الذی شھدت بحفظه العلماء الثقات واعترفت بضبطه المشائخ الاثبات۔ ولم ینکر فضله علماء ھذا الشان۔ ولا تنازع فی صحة تنقیدہ اثنان الامام الھمام حجة الاسلام ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری[3]۔

امام بخاری حافظِ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ احادیث کی پرکھ

---

[1] ہدی الساری مقدمہ فتح الباری لابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) ص ۴۸۵

[2] تاریخ بغداد للخطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) جلد ۲ ص ۲۱۔

[3] عمدة القاری شرح بخاری جلد ۱ ص ۵

اور نقد میں بھی غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے اور ان کے اس مقام و مرتبہ کا اعتراف ثقہ اور گرامی مرتبت علماء نے کیا ہے۔ خصوصاً احادیث کی پرکھ اور نقد و جرح میں ان کی غیر معمولی بصیرت و صلاحیت کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی (م ۱۳۰۲ھ) فرماتے ہیں:

الامام البخاری معجزة للرسول البشیر والنذیر صلی اللہ علیہ وسلم حیث وجد فی امتہ مثل ھذا الفرد العدیم النظیر من کان وجودہ من النعم الکبری علی العالم امیر المومنین فی الحدیث احد سلاطین الاسلام الامام المجتھد ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراھیم بن المغیرہ بن بردزبة الجعفی مولاھم امیر المومنین وسلطان المحدثین الحافظ الشھیر والناقد البصیر وقد جمع الثقات علی حفظہ واتقانہ وجلالة قدرہ وتمیزہ عما عداہ من اھل عصرہ۔[1]

یعنی امام بخاریؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہیں کہ حضرت کی امت میں ایسا بے نظیر شخص پایا گیا ہے جو بے مثل ہے جس کا وجود ایک نعمتِ کبریٰ ہے جو امیر المومنین فی الحدیث سلطان المحدثین امام المجتہدین اور صاحبِ بصیرت ناقد ہیں۔ امام بخاریؒ کی جلالت قدر، حفظ اور اتقان پر پوری دنیا کے ثقہ اصحابِ علم نے اتفاق کیا ہے۔

شیخ نور الحق (م ۱۰۷۳ھ) جو شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کے صاحبزادے ہیں، فرماتے ہیں:

"... (امام بخاریؒ) در زمانِ خود در حفظِ حدیث و اتقان آں و فہم معانی

---

[1] سیرة البخاری مطبوعہ مولانا عبد السلام مبارک پوری (م ۱۳۴۲ھ)، ص ۱۳۴

کتاب وسنت وحدت ذہن وجودت قریحہ و وفور فقہ وکمال زہد وغایت ورع
کثرت اطلاع بر طرق حدیث و علل آں، دقت نظر، قوت اجتہاد و استنباط
فروع از اصول نظیرے نداشت [1]

مولانا عبدالسلام مبارک پوری (م ۱۳۴۲ھ) نے علامہ سبکی (م ۷۵۶ھ) کا ایک شعر نقل کیا ہے جس سے حضرت امام کے علمی تبحر، جلالت قدر اور ان کی مدح وستائش کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ علامہ سبکی فرماتے ہیں:

علا عن المدح حتی مایزان به
کانه المدح من مقداره یضع [2]

مدح کرنے والوں کی مدح ان کے ہم رتبہ
نہیں ہوسکتی ہے اس لیے کہ مدح ان کے رتبہ
سے نیچے رہ جاتی ہے۔

اخلاق وعادات اور طرز معاشرت امام صاحب کی مقدس زندگی میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے بڑے بڑے نامور اور باکمال لوگوں کا ذہن خالی ہے۔ ان کی طبیعت سخت غیور، خوددار، اور بے تکلف تھی۔ دولت دنیا سے بے نیاز تھے۔ اپنے والد کے ترکہ میں بہت مال پایا تھا۔ لیکن سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے تھے اور بسا اوقات آپ کو دو تین بادام پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں:

وکان قلیل الاکل جداً مفرداً فی الجود وقال کان یقنع
کل یوم بلوزتین وثلاث [3]

---

[1] شرح فارسی بخاری مقدمہ

[2] سیرۃ البخاری ص ۱۳۵

[3] فیما یجب حفظ الناظر ص ۲۔

امام صاحب نے کسی امیر/بادشاہ کی فیاضی سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا - اور نہ ہی کبھی کسی سلطان یا امیر کے در دولت پہ حاضری دی - آپ کا بخارا سے جلا وطن ہونا بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے - چنانچہ جلاوطنی منظور کر لی، مگر قصر شاہی میں حاضری دینا منظور نہیں کیا۔[1]

امام صاحب نے ساری زندگی سادگی اور قناعت کو اختیار کیے رکھا - آپ میں حد درجہ انکساری تھی - رواداری میں اپنی مثال آپ تھے - بے تعصبی آپ کا خاص وصف تھا، ورزش کے بہت شوقین تھے - صفائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔[2]

امام بخاری کا مسلک امام بخاری کے مسلک کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے اور کبار محدثین کے ساتھ ہمیشہ سے یہ معاملہ رہا ہے کہ ہر ایک نے اُن کو اپنے اپنے مسلک کا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - یہی معاملہ امام بخاری کے ساتھ بھی ہوا - علامہ تقی الدین السبکی (م ۷۵۶ھ) نے آپ کو شافعی لکھا ہے۔[3] مولانا سید نواب صدیق حسن خان قنوجی رئیس بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) نے بھی علامہ سبکی کی تائید کی ہے۔[4] حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) کے نزدیک امام بخاری کے مباحث فقیہہ کا غالب حصہ امام شافعی کے مسلک سے ماخوذ ہے۔[5] علامہ ابن القیم (م ۷۵۱ھ) کی تحقیق میں امام بخاری حنبلی المسلک تھے۔[6] علامہ طاہر الجزائری کی نظر میں مجتہد مطلق تھے۔[7] علامہ سید انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ آپ بلاشک و شبہ مجتہد مطلق تھے۔[8]

جلاوطنی اور انتقال بخارا میں امام صاحب ایک مدت سے راحت و آرام سے زندگی بسر

---

[1] مقدمہ فتح الباری - ص ۴۹۴

[2] تہذیب التہذیب لابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)، جلد ۹ ص ۴۷

[3] طبقات الشافعیہ [4] ابجد العلوم ص ۸۱۰

[5] فتح الباری جلد ۱ ص ۱۲۳ [6] علام الموقعین جلد ۱ ص ۲۲۶

[7] توجیہ النظر ص ۱۸۵ [8] فیض الباری جلد ۱ ص ۵۸

کر رہے تھے۔ لیکن اپنی غیور طبیعت اور خودداری کی بدولت آپ کو جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ چنانچہ آپ بخارا سے نکل کر سمرقند کے قریب ایک چھوٹے سے قریہ میں جہاں آپ کے رشتہ دار رہتے تھے، تشریف لے گئے۔ جلاوطنی کا انہیں بہت افسوس تھا۔ چنانچہ آپ کی زبان سے بے اختیار نکلا:

الٰہی باوجود وسعت کے زمین میرے لیے تنگ ہوگئی ہے۔ اس لیے
تو مجھ کو اپنے پاس بلا لے[1]

عجیب اتفاق ہوا کہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ رمضان المبارک کا مہینہ گزار کر اوائل شوال میں سمرقند جا رہے تھے کہ راستہ میں پیام اجل آگیا۔ اور یکم شوال ۲۵۶ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۸۶۹ء بروز دوشنبہ ۶۲ سال کی عمر میں انتقال کیا[2]

امام بخاریؒ کی علمی خدمات

تصانیف ۱۔ الادب المفرد ۲۔ التاریخ الکبیر ۳۔ التاریخ الاوسط

۴۔ التاریخ الصغیر	۵۔ خلق افعال العباد	۶۔ جزء رفع الیدین
۷۔ قرأۃ خلف الامام	۸۔ برالوالدین	۹۔ کتاب الضعفاء
۱۰۔ الجامع الکبیر	۱۱۔ التفسیر الکبیر	۱۲۔ کتاب الاشربہ
۱۳۔ کتاب الہبہ	۱۴۔ کتاب المبسوط	۱۵۔ کتاب الکنی
۱۶۔ کتاب العلل	۱۷۔ کتاب الفوائد	۱۸۔ کتاب المناقب
۱۹۔ اسامی الصحابہ	۲۰۔ کتاب الوجدان	۲۱۔ قضایا الصحابہ
۲۲۔ الجامع الصحیح	۲۳۔ المسند الکبیر	۲۴۔ کتاب الرقاق

۲۵۔ الجامع الصغیر فی الحدیث۔ (باقی)

[1] تاریخ بغداد للخطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) جلد ۲ ص ۳۴

[2] ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۴

پاکستانی حجّاج کی بہبود کے لیے چند تجاویز

جناب سید اسعد گیلانی صاحب - ایم - این - اے

پاکستان کا حاجی جس والہیت کے ساتھ حج کو جاتا ہے اور پھر غریبی کی حالت میں عمر بھر تھوڑی تھوڑی کمائی بچا کر آخری عمر میں اس نیک سفر پر نکلتا ہے، اس کا مستحق ہوتا ہے کہ اُسے قدم بر قدم محبت کیش رفیق اور ایثار پیشہ کارکن اور خدمت پسند رضا کار آ آ کر ملیں اور ایک طرف اپنی حکومت کے کارندے اس کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچانے والے ہوں اور دوسری طرف سعودی حکومت کے افسران اور کارکن اور شہری گویا اس کے مخلص میزبان ثابت ہوں — مگر پاکستانی حاجی اپنی غریبی اور کم علمی اور کمزور صحت کے ساتھ جس درماندگی کا شکار ہوتا ہے اس میں کوئی بھی کمی کرنے والا اُسے نہیں ملتا۔ نہ حکومت کو اپنی ذمہ داریوں کا لحاظ ہے اور نہ حاجی اور ملازم اور رضا کار حضرات اس بے والی وارث حاجی کی رہنمائی یا دلجوئی یا مدد کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔ یہ مظلوم ترین مخلوق عبادات کے شوق میں خدا کے حرم میں جگہ جگہ دھکے کھاتی پھرتی ہے۔ اس قصّے کو اسعد گیلانی صاحب نے اپنے تجربے کی روشنی میں بڑے مؤثر ادبیانہ انداز میں لکھا، مگر افسوس کہ جگہ کی کمی نے مجبور کیا کہ ان کے جائزۂ حالات کے اہم پہلو کو چھوڑ کر صرف ان کی تجاویز کو شائع کر دیا جائے۔ (ن ـ ص)

۱ــــ پاکستانی حجاج کا تمام نظم و نسق حکومتِ پاکستان کو اپنے ذمہ لینا چاہیے کیونکہ اکثر مسلمان ممالک کی منظم اور مہذب حکومتیں حجاجِ کرام کے تمام مناسک حج کو بہ سہولت ادا کرنے کے لیے ملک کے اندر اور باہر قدم قدم پر ان کی مدد اور حفاظت کرتی ہیں۔

۲ــــ چند منتخب افراد پر مشتمل ایک وفد بنایا جائے جو حکومتِ ایران، ترکی، انڈونیشیا اور نائیجیریا کی حکومتوں کے انتظامات کا گہرا مطالعہ کرے اور ان کی روشنی میں پاکستانی حجاج کے انتظامات کے سلسلے میں جامع منصوبہ تیار کرے۔

۳ــــ حکومتِ پاکستان کا وزارتی سطح پر ایک کمیشن سعودی حکومت سے حجاج کی سہولتوں کے بارے میں باقاعدہ مذاکرات کرے اور تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایک معاہدے پر دستخط کرے تاکہ سعودی عرب کی حکومت پاکستانیوں کے ساتھ ذمہ دارانہ اور مناسب طرزِ عمل اختیار کرے۔

۴ــــ پاکستان میں حاجیوں کی تربیت اور رہنمائی کے سلسلے میں جو کیمپ لگائے جاتے ہیں ان میں مناسکِ حج اور معلوماتِ حج کے علاوہ سعودی عرب کے بارے میں معلومات، زبان، روزمرہ کے ضروری الفاظ، آنے والی مشکلات اور اُن سے بچنے کی تدابیر کے عملی پہلوؤں سے بھی حجاج کو آگاہ کیا جائے۔

۵ــــ جدہ میں ہر فلائیٹ پر نمایاں بیج اور بینر کے ساتھ پاکستانی حاجیوں کے استقبال کا انتظام، ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی دروازے پر نمایاں استقبالیہ آفس، محصولات کے بارے میں رہنمائی اور سواریوں کی فراہمی۔ مکہ مکرمہ میں حکومت کے اہتمام میں اجتماعی قیام گاہیں اور رجسٹریشن، ہر حاجی کو لازماً شناختی کارڈ[1] کا اجرا، حرم کی آمد و رفت میں

[1] محض شناختی کارڈوں کا اجرا ہی کافی نہیں، دھات کی ایک (پوسٹ کارڈ سائز) تختی پر اوّلاً پاکستان، پھر حاجی کا نمبر، نمبر پاسپورٹ و تاریخ کا اجرا، صوبہ، ضلع، مقام، نام، ولدیت، زوجیت، معلّم کا نام، قیام کا مکان یا اپارٹمنٹ اور گروپ انچارج کا نام درج ہو۔ یہ اندراجات اردو، عربی، انگریزی تین زبانوں میں ہونے چاہئیں۔ جن خانوں کے اندراجات بدل (باقی بر صفحہ آئندہ)

اجتماعی آمد و رفت اور حفاظت کا انتظام اور سعودی حکومت سے معاملات میں پاکستانی حکام کی مداخلت بہت ضروری ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ پاکستانی حکام کا سعودی حکام سے رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے اور جہاں ہے وہاں فدویانہ ہے اور کمزوری پر مبنی ہے۔

۶ — حکومت پاکستان منیٰ میں بھی خود کیمپ لگانے کا بندوبست کرے اور اپنے حجاج کو معلّمین کی چیرہ دستیوں اور بدانتظامیوں سے نجات دلوائے تاکہ کشادہ، ہوادار، بے بُو، ستھری جگہ، وافر پانی، صاف ٹینٹ اور بیت الخلاء میسر آ سکیں۔ موجودہ حالت اس کے برعکس ہے۔

۷ — میرے علم میں ہے کہ بیوروکریسی کے سینکڑوں ارکان خدمتِ حجاج کے نام پر سعودی عرب میں کئی کئی ماہ کی ڈیوٹیاں دیتے ہیں اور ان میں دفتری کارندے، ڈاکٹروں کے وفود اور دیگر عملہ شامل ہے۔ خدا جانے یہ لوگ کہاں رہتے ہیں۔ حاجیوں سے ملنے ملاتے ہیں نے انہیں کہیں نہیں دیکھا۔ ایسا انتظامی بندوبست کیا جائے کہ ان پر خرچ ہونے والا لاکھوں روپیہ خدمتِ حجاج کی صورت میں واقعی وصول ہو سکے۔ نیز سارے عملے اور انتظام کی مسلسل چیکنگ گشتی یا معائنہ ٹیموں کے ذریعے ہوتی چاہیے۔

۸ — گروپ اسکیم کو مؤثر و فعال بنانا چاہیے اور گروپ لیڈر صرف اُسے مقرر کیا جائے جو پہلے کم از کم ایک یا دو دفعہ حج کر چکا ہو۔ جوان ہو، ذمہ دار ہو اور باصلاحیت ہو اور وہاں جا کر نظم قائم کرنے کی پوزیشن میں ہو تاکہ مکہ میں جا کر گروپ منتشر نہ ہو جائے۔

۹ — حج کو غیر معمولی گراں کر دیا گیا ہے جو ایک عبادت ہے۔ حکومت ان اخراجات کو کم کرنے کی کوشش کرے۔ حج کے اخراجات کو بیس ہزار کے اندر اندر ہونا چاہیے۔ حکومتِ ایران

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

جاتے ہوں۔ ان کی جگہ پر پلاسٹک کی نئی چیپیاں لگانا ممکن ہے اور یہ تختیاں کندھے یا سینے پر لگی ہوں یا عورتوں اور بچوں کے گلے میں لٹکی ہوں۔ اسی طرح کے لیبل سامان کے ہر تگ اور ہر بکس یا ہینڈل پر لگے ہوں۔ (ا۔ ح)

اپنے حجاج کو سبسڈی دیتی ہے۔ ضرورت ہو تو پاکستان میں بھی ایسا کیا جائے۔ نام نہاد ڈویلپمنٹ سکیموں کے ذریعے ملک میں ایک لوٹ کا عالم ہے اور کروڑوں روپیہ افسروں کی عیاشیوں اور ملازمتوں پر صرف ہو رہا ہے۔ اگر سالانہ چند کروڑ روپے حج سبسڈی کے لیے متعارف کرا دیے جائیں تو اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں ایک قدم کی پیش رفت ہو سکتی ہے۔

۱۰۔ اگر معلم کا ادارہ ختم نہیں ہو سکتا تو کم از کم حکومتِ پاکستان سعودی حکومت سے سفارش کرے کہ:

ا: ان کا کوٹہ ختم کر دیا جائے۔

ب: نااہل غیر حاضر معلمین کو ختم کیا جائے۔

ج: جس معلم کے خلاف تین شکایات آجائیں اس کا لائسنس منسوخ کیا جائے۔

د: رہائش کا انتظام معلم کے دائرۂ کار سے باہر لے آیا جائے جو حکومت خود سرانجام دے۔

۱۱۔ حکومتِ سعودی عرب کو آنے والے حجاج کی پسندیدہ یا چند ضروری زبانوں میں ایک ایسا کتابچہ خود تیار کر کے مفت فراہم کرنا چاہیے جس میں حاجی کو مقامات و مناسکِ حج کے متعلق تصاویر کے ساتھ رہنمائی دی گئی ہو۔ تمام سرکاری واجبات کا اس میں اندراج ہو کہ کون سی رقم کہاں دینی ہے۔ تمام معلمین کے تفصیلی پتے اور کوائف درج ہوں۔ جن محکموں یا دفتروں سے حاجی کو واسطہ پڑتا ہو اس کا تذکرہ کیا جائے۔ ذرائع سفر اور ان کے کرایہ جات اور سفروں کے فاصلے وغیرہ سب لکھے ہوں۔ حاجی کو بتایا جائے کہ اسے کوئی تکلیف یا نقصان پہنچے یا اسے ستایا جائے تو کس معاملے میں وہ کس شخص یا ادارے سے رجوع کرے۔ نمایاں ہوٹلوں کے قیام کے متعلق اہم معلومات اور ان کے مصارف اور ان کی فراہم کردہ خدمات وغیرہ کا تذکرہ بھی کیا جائے۔

۱۲۔ حکومتِ سعودی عرب پاسپورٹ و ویزا دفاتر کے علاوہ ہوائی جہاز کے کسٹم کاؤنٹر یا دیگر ضروری دفاتر میں ایسے ترجمان فراہم کرے جو زمانہ حج میں باہر سے آنے والوں کے لیے سہولت کا باعث ہوں۔

بیعتِ عقبہ ثانیہ اور حضرت عباسؓ

جناب ڈاکٹر محمد سلیمان صاحب۔ استاد شعبۂ علومِ اسلامیہ۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

تاریخِ ملتِ اسلامیہ یا سیرتِ مطہرۂ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا دائرہ ہو، یا دیگر کسی علمی بحث کا میدان، ہم تہِ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ذہانت و قابلیت رکھنے والے مسلمان نوجوان نئی نئی تحقیقات کریں، پچھلے ریکارڈ کی چھان پھٹک کریں کوئی نئی بات دریافت کریں یا کسی غلط مسلمہ کمزوری کو واضح کریں۔

اسی نقطۂ نظر سے ہم نے درج ذیل مضمون کو اپنے ہاں بخوشی جگہ دی ہے مگر ساتھ ہی ہم ڈاکٹر محمد سلیمان صاحب کو مضمون کے بعض ایسے مندرجات پر متوجہ کرنا چاہتے ہیں جنہیں سامنے رکھ کر انہیں اپنے سارے کام پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

ایک یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ خود صاحبِ مضمون ہی اس تاریخی حقیقت کو لکھتے ہیں کہ مدینہ والوں نے بیعتِ عقبہ کے وقت آنحضورؐ کو "مدینہ تشریف لے چلنے کی دعوت دی"۔ مگر آگے چل کر یہ بات حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کی زبان سے ادا ہوتی ہے کہ "اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں"۔ یہ تو نمایاں تضاد ہے۔

مسودے کے صفحہ نمبر ۲ میں ہے کہ آنحضرتؐ نے ہجرت کے فیصلے کا اعلان فرما دیا۔ کیا ایک خفیہ مجلس میں کوئی بات ایسی بھی کہی جا سکتی ہے جسے "اعلان" کہا

جاتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ حضورؐ نے مدینہ جانے کا وعدہ کرلیا ہو یا حامی بھرلی ہو، "املاق" کیا معنی؟

علیٰ ہذا القیاس ایک نئی بات کو ثابت کرتے ہوئے ضروری احتیاطیں کرلینی چاہئیں۔ (ف۔ح)

حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب ہماری تاریخ کی ایک نہایت درخشاں شخصیت ہیں۔ آپ حضورؐ سرورِ کونین کے عمِ محترم ہیں۔ اور دیگر چچاؤں کی نسبت آپ کو یہ خصوصی اعزاز حاصل ہے کہ آپ آنحضرتؐ کے وصال کے وقت بھی موجود تھے اور اس کے بعد بھی کافی عرصہ تک زندہ رہے ہیں۔ اس وجہ سے آنحضرتؐ کے بعد اُس اُلفت و محبت کا ایک حصہ انہیں حاصل ہوگیا جو مسلمان اپنے آقا سے رکھتے تھے۔ اِس رشتے کے علاوہ آپ پیغمبر آخرالزمان کے ایک برگزیدہ صحابی ہیں اور اس شرفِ صحبت کے باعث وہ ہماری آنکھوں کا تارا ہیں۔ مزید برآں آپ بنوعباس کے جدِ امجد ہیں اور عباسیوں نے صدیوں تک عالم اسلام پر حکمرانی کی ہے۔ ان وجوہ کے باعث ہمارے لٹریچر میں حضرت عباسؓ کے فضائل و محاسن کا ذکر جابجا ملتا ہے۔

ہم اُن ادب و احترام پوری طرح ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آج کی نشست میں ایک ایسی بات کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں جو شاید بنوعباس کا جدِ امجد ہونے کی حیثیت سے عباسی دور دور میں مدوّن ہونے والے اسلامی لٹریچر میں آپ کے فضائل و محاسن میں جگہ پاگئی ہے، حالانکہ یا تو وہ درحقیقت آپ کے محاسن میں شامل ہی نہیں، یا پھر اس میں بحث و نظر کی گنجائش ہے۔

یہ بات بیعتِ عقبۂ ثانیہ سے متعلق ہے یعنی جس موقع پر آنحضرتؐ کو انصار مدینہ نے ہجرت کی دعوت دی اور آپؐ نے اسے قبول فرماکر مدینہ جانے کا فیصلہ فرمایا۔ کتب تاریخ و سوانح میں اس واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح دی گئی ہے۔

عقبہ میں منعقد ہونے والی پہلی بیعت کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لیے حضرت مُصعَبؓ بن عُمیرؓ کو روانہ فرمایا۔ انہوں نے

بحیثیت مبلغ اس قدر اخلاص، جانفشانی اور حکمتِ عمل سے کام کیا کہ جلد ہی مدینہ کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اور لوگوں کی ایک معتد بہ تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ موسمِ حج میں ان میں سے تقریباً ۷۰ افراد مکہ آئے۔ انہوں نے خفیہ طور پر عقبہ کے مقام پر آنحضرتؐ سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا ایک مقصد یہ تھا کہ آپؐ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے جانے کی دعوت دی جائے۔ اس موقع پر رسول اکرمؐ کے ساتھ آن کے چچا عباس بن عبدالمطلب بھی تھے[1]۔ جنہوں نے آنحضرتؐ کے سرپرست اور وکیل کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے یہ کوشش فرمائی کہ دونوں فریق (یعنی آنحضرتؐ اور انصار) کسی ایسے معاہدے پر رضامند ہو جائیں جس کی رو سے آنحضرتؐ بلا خوف و خطر تبلیغِ اسلام کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے گفتگو کا آغاز ان الفاظ میں کیا۔

> "اے گروہِ خزرج! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمن کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے۔ اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں، اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی سے جواب دے دو۔"[2]

---

[1] ابنِ سعد نے بحوالہ واقدی بیان کیا ہے کہ انصار آپؐ کو تلاش کرتے کرتے حضرت عباسؓ کے دولت کدہ پر پہنچ گئے، جہاں آنحضرتؐ بھی تشریف فرما تھے۔ انصار نے آپؐ سے ملاقات کا وقت مانگا۔ حضرت عباسؓ نے انہیں خطرے کا احساس دلا کر مشورہ دیا کہ فلاں وقت چپکے سے باہم ملاقات کر لو۔ پھر طے شدہ مقام و وقت پر وہ خود بھی آپ کے ساتھ گئے۔ محمد ابن سعد، طبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت جلد ۴، ص ۷ اور بلاذری، انساب الاشراف، حواشی حمید اللہ، دار المعارف مصر، جلد ۱، ص ۲۴۰ کے مطابق حضرت عباسؓ نہ صرف موقع پر موجود تھے، بلکہ "کان العباس المتولی لاخذ البیعۃ للنبی واعتقادھا بالعھد والمیثاق۔

[2] ابنِ ہشام سیرۃ النبیؐ، تعلیقات محمود سید الطحطاوی، قاہرہ، ۱۳۴۶ھ، جلد ۱، ص ۲۶۶۔ طبری، "تاریخ الرسل والملوک" طبع حسینیہ مصریہ جلد ۲، ص ۲۳۸، (باقی بر صفحہ آئندہ)

حضرت عباسؓ کی تقریر سن کر اہلِ مدینہ نے یقین دلایا کہ وہ رسول اکرمؐ کی ہر صورت حفاظت کریں گے اور اس یقین دہانی کے بعد آنحضرتؐ نے ہجرت کے فیصلے کا اعلان فرما دیا۔

اس واقعہ میں درج ذیل باتیں محلِ نظر معلوم ہوتی ہیں۔

۱- کیا حضرت عباسؓ واقعتاً عقبہ میں آنحضرتؐ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے؟

۲- اگر مذکورہ بالا سوال کا جواب ہاں میں ہے تو کیا حضرت عباس کا یہ فرمانا "ان کا خاندان ہمیشہ آنحضرت کا سینہ سپر رہا ہے" درست ہے۔

۳- کیا اُن کی تقریر کے آخری حصہ "کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں اگر تم ان کی حفاظت کر سکتے ہو تو لے جاؤ، ورنہ ابھی سے جواب دے دو" اس طرح ہونا چاہیے کیا یہ حصہ معاملات کے لین دین میں ان کی مہارت کا اظہار کرتا ہے یا ان الفاظ کے ساتھ اُنہوں نے آنحضرتؐ کی پوزیشن کو انصار کے مقابلے میں کمزور کر دیا ہے۔

ان باتوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے کچھ تفصیلات پر نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت رسول اکرمؐ نے دعویٰ نبوت فرمایا تو اہل مکہ کی اکثریت نے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مزید برآں انہوں نے ہر ممکن کوشش کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

مقریزی، امتاع الاسماع، مطبوعہ قطر، ص ۳۵۔ مقریزی یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اجلاس شروع ہونے سے قبل جناب عباسؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو عقبہ کے ایک سرے پر اور حضرت علیؓ کو عقبہ کے دوسرے سرے پر کھڑا کر دیا تھا تاکہ وہ گرد و پیش پر نظر رکھیں اور اجلاس کسی بیرونی مداخلت کے بغیر جاری رہے۔

ابنِ سعد جلد ۱ ص ۲۲۲ اور جلد ۴، ص ۸۰۷ پر حضرت عباسؓ کی تقریر پوری درج کی گئی ہے" یا معشر الخزرج انکم قد دعوتهم محمداً الى ما دعوتموه اليه ومحمد من اعز الناس فى عشيرته يمنعه والله منا من كان على قوله ومن لم يكن منا على قوله يمنعه للحسب والشرف۔

کہ آپؐ بھی تبلیغِ رسالت سے باز نہ آجائیں۔ اُس وقت آپؐ کے چچا حضرت ابوطالب ہاشمی خاندان کے سربراہ تھے۔ اُنھوں نے فکری اختلافات کے باوجود اپنے خاندان کے ایک فرد کو اہلِ مکہ کے ظلم وستم کے سامنے بے یارومددگار چھوڑ دینا وضع داری اور اپنے منصب کے تقاضوں کے خلاف تصور کرتے ہوئے ہر ممکن طریق سے آپؐ کا دفاع کیا۔[1] ابوطالب کی وفات کے بعد خاندان کی سربراہی ابولہب کے حصہ میں آئی جو آنحضرتؐ کے مشن کا سخت مخالف تھا۔ اور آپ کو تنگ کرنے میں پیش پیش تھا۔ لیکن ذمہ داری کے احساس نے اُسے اپنا طرزِ عمل بدلنے پر مجبور کر دیا۔ یعنی اب وہ سمجھنے لگا کہ اگر آنحضرتؐ کو نقصان پہنچا تو سربراہِ خاندان ہونے کے سبب اس کی ناک کٹ جائے گی اور عرب میں یہ مشہور ہو جائے گا کہ ابولہب ایک ایسا کمزور سربراہ ہے جو اپنے افرادِ خاندان کی حفاظت سے قاصر ہے۔ اس عصبیت و حمیت کے باعث اس نے آنحضرتؐ سے کہہ دیا کہ آپؐ اپنے راستے پہ چلتے رہیں، میں ابوطالب کی طرح آپؐ کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ اہلِ مکہ کو یہ بات پسند نہ آئی کہ اُن کا سابقہ رفیقِ کار ان کے دشمن کا سرپرست بن جائے۔ اس لیے وہ مشورہ کر کے ابولہب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بس بھتیجے کی تم حفاظت کر رہے ہو اُس سے یہ تو پوچھو کہ تمھارا باپ عبدالمطلب جنت میں ہے یا دوزخ میں۔ ابولہب نے آنحضرتؐ سے استفسار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ دوزخی ہے۔ اہلِ مکہ کا مقصد پورا ہو گیا۔ کیونکہ اس جواب سے ابولہب ناراض ہو کر کہنے لگا کہ میں تمھارے لیے تمام اہلِ مکہ سے دشمنی مول لوں اور تم میرے باپ کو جہنمی قرار دو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی پناہ واپس لیتا ہوں۔[2]

اس نئی صورتِ حال میں آپؐ کے لیے مکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ کیونکہ اہلِ مکہ کی اکثریت آپؐ کے خون کی پیاسی تھی۔ اور آپؐ کے خاندان کا سربراہ آپ کی حفاظت کی ذمہ اُٹھانے سے

---

[1] ابنِ ہشام، سیرۃ النبی علی حاشیۃ الروض الاُنف للسُّہیلی، مکتبہ فاروقیہ ملتان جلد ۱ ص ۲۶۰۔

[2] ابنِ سعد جلد ۱ ص ۲۱۱۔

انکاری تھا۔ اس وجہ سے آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ تبلیغ رسالت کے لیے کسی اور علاقے کا رُخ کرنا چاہیے۔ آپؐ کی نظر طائف پر پڑی اور آپؐ نے طائف کا سفر اختیار فرمایا:

طائف میں آپؐ کا قیام کم و بیش ایک ماہ رہا۔ اس دوران وہاں کے کسی شخص نے اسلام قبول نہیں کیا۔ (سوائے ایک غلام کے اور وہ بھی واپسی کے سفر میں)[1] اور نہ ہی کسی صاحب حیثیت شخص نے آپؐ کو پناہ دینے کا اعلان کیا تاکہ آپؐ وہاں مزید رُک کر تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں۔ بلکہ آپؐ کو اس قدر تنگ کیا گیا کہ آپ انتہائی بے چارگی کے عالم میں وہاں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔[2]

اب آپ کی منزل مکہ کے سوا کیا ہو سکتی تھی، لیکن وہاں سے ایک ماہ کی مسلسل غیر حاضری کو چھپانا بھی مشکل تھا۔ جن لوگوں نے (اہلِ طائف) نے پناہ دینے سے انکار کر کے نکال دیا تھا۔ ان سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ وہ اہلِ مکہ کو آپؐ کے حالیہ دورۂ طائف اور اس کے مقصد سے بھی آگاہ کر دیتے۔ اس صورت میں اہلِ مکہ کا غصہ مزید بھڑک اُٹھنے کا اندیشہ تھا۔ اسی لیے آپؐ نے معززین طائف سے کہا تھا کہ اہلِ مکہ کو میرے اس مشن کے بارے میں نہ بتانا،

---

[1] ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ علی حاشیۃ الروض الانف، جلد ۱، ص ۲۶۲
طبری جلد ۲، ص ۲۳۰۔

[2] ابنِ ہشام علی حاشیہ الروض الانف۔ جلد ۱ ص ۲۶۰ - محمد بن عبدالبرؒ، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، مطبوعہ بغداد، جلد ۱ ص ۲۷۔

[3] ابنِ ہشام، سیرۃ النبیؐ علی حاشیۃ الروض الانف جلد ۱، ص ۲۴۰ کے مطابق "فخرج رسول الله الی الطائف یلتمس النصرۃ والمنعۃ بھم من قومہ ورجاء ان یقبلوا منھم ما جاءھم بہ من الله۔ بقول سید مودودی صاحب' وہاں جا کر آپؐ نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ اسلام کے کام میں میری مدد کریں۔ اور میری قوم کے جو لوگ میری مخالفت کر رہے ہیں ان کے مقابلے میں میری حمایت کریں۔ سید مودودی، سیرت سرورِ عالمؐ جلد ۲ ص ۶۳۳۔

لیکن انہوں نے یہ بات بھی ماننے سے انکار کر دیا تھا[۱] دریں حالات آپؐ نے ضروری سمجھا کہ مکہ میں داخل ہونے سے قبل معززین مکہ میں سے کسی کی پناہ حاصل کر لیں۔

ابن سعد نے واقدی کی روایت نقل کی ہے کہ نخلہ سے جب آپ نے مکہ تشریف لے جانے کا قصد فرمایا تو حضرت زید بن حارثہ نے عرض کیا کہ آپؐ وہاں کیسے داخل ہوں گے، جب کہ قریش آپؐ کو نکال چکے ہیں[۲] آگے کی بات واقدی نے مختصر کر دی ہے، مگر ابن اسحاق نے اس کو مفصل بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حرا پہنچ کر آپؐ نے عبداللہ بن الاریقط کو اخنس بن شریق کے پاس بھیجا تاکہ وہ آپ کو اپنی پناہ میں لے لے۔ اس نے کہا میں تو حلیف ہوں اور حلیف قریش کے اصل خاندانوں کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے سکتا۔ پھر آپؐ نے عبداللہ کو سہیل بن عمرو کے پاس بھیجا۔ اس نے جواب دیا کہ بنی عامر بن لوی بنی کعب کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد آپؐ نے قاصد کو مُطعِم بن عدی نوفلی کے پاس بھیجا جس نے پناہ دینے پر رضامندی ظاہر کر دی اور اپنے مسلح بیٹوں کی معیت میں بیت اللہ میں اعلان کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی پناہ میں ہیں۔ اسی اعلان کے باعث مکہ میں آنحضرتؐ کا داخلہ اور پھر قیام ممکن ہو سکا[۳]

---

[۱] ابن ہشام علی حاشیۃ الروض الانف جلد ۱، ص ۲۴۰
طبری جلد ۲، ص ۲۳۰۔

[۲] ابن سعد جلد ۱، ص ۲۱۲۔

[۳] ابن قتیبہ، کتاب عیون الاخبار، قاہرہ، ۱۹۲۵ء، ص ۴۹ — ابن عبدالبر، الاستیعاب جلد ۱، ص ۲۳ — ابن سعد جلد ۱، ص ۲۱۲ — طبری جلد ۱، ص ۲ — بلاذری، انساب الاشراف جلد ۱، ص ۱۵۳، ۲۳۷ — ابن الاثیر، تاریخ الکامل، طبع منیریہ قاہرہ، ۱۳۴۹ھ جلد ۲، ص ۶۴ — مقریزی ص ۲۸ — شبلی، سیرۃ النبی، جلد ۱، ص ۲۴۵ معین الدین ندوی، تاریخ اسلام، ۱۹۴۸ء جلد ۱، ص ۲۹ — مولانا مودودی سیرت سرور عالم جلد ۲، ص ۶۳۹ — ابو زہرہ، خاتم النبیین دوحہ قطر، ۱۴۰۰ھ جلد ۱، ص ۵۵۴ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اس صورتِ حال کے بغور جائزہ سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ ابوطالب کی وفات کے بعد جب ابولہب نے آپؐ کی حفاظت سے انکار کر دیا تو آپؐ کا مکہ میں رہنا انتہائی مخدوش ہو گیا اور بہ روایت واقدی تو آپؐ کو مکہ سے نکال ہی دیا گیا تھا۔

۲۔ ابولہب کے زیر اثر بنو ہاشم بحیثیت خاندان آپؐ کی حفاظت سے دست کش ہو چکے تھے، جبھی تو آپؐ کو طائف میں جا کر پناہ تلاش کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

۳۔ بنو ہاشم میں سے جو لوگ مسلمان تھے (مثلاً سیدنا حمزہؓ اور سیدنا علیؓ) وہ اتنے طاقتور اور بااثر نہیں تھے کہ اپنے خاندان کی اکثریت کی مخالفت مول لے سکیں اور اپنی جانب سے آنحضرتؐ کی حفاظت کی ذمہ داری لے سکیں۔ اس بات کی شہادت یہ ہے کہ ابولہب کے انکار کے بعد پہلے تو آپؐ نے معززین طائف سے رجوع کیا اور وہاں سے مایوسی کے بعد ایسے معززین مکہ سے رجوع کیا جن میں نہ تو کوئی مسلمان ہاشمی تھا اور نہ کافر ہاشمی۔

مزید برآں واقعۂ طائف کے بعد سفرِ ہجرت تک ہمیں کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ مُطعِم بن عدی نے اپنی دی ہوئی امان کو واپس لے لیا ہو اور آنحضرتؐ کو دوبارہ کسی ہاشمی یا کسی اور مکی سردار کے پاس پناہ کی تلاش میں جانا پڑا ہو۔ نہ ہی کوئی شہادت اس امر کی مظہر ہے کہ ابولہب یا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

منٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ، آکسفورڈ، ۱۹۵۳ء ص ۱۴۰۔

مُطعِم بن عدی کی اسی خدمت کے باعث آنحضرتؐ نے جنگِ بدر کے قیدیوں کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ اگر آج مطعم زندہ ہوتا اور ان قیدیوں کے بارے میں مجھ سے بات کرتا تو میں اس کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا۔ دیکھیے واقدی، کتاب المغازی، حواشی مارسدن جونز، آکسفورڈ ۱۹۶۶ء جلد ۱ ص ۱۱۰ ــ ابوعُبَید قاسم بن سلام، کتاب الاموال تعلیقات محمد خلیل ہراس، قاہرہ، ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۴ ــ ابوداؤد سنن، تعلیقات محمد محی الدین عبداللہ قاہرہ ۱۳۶۹ھ، جلد ۳، ص ۸۲ ــ ابن عبدالبر جلد ۱، ص ۲۳۱۔

دیگر ہاشمیوں نے اس بات کو عار سمجھتے ہوئے کہ اُن کے خاندان کا ایک فرد بنو نوفل کی پناہ میں زندگی بسر کر رہا ہے، صورتِ حال میں تبدیلی کی کوشش کی ہو۔ یعنی یہ اعلان کیا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہمارے ہیں، ان کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ اور ہم آئندہ سے یہ فرض خود ادا کریں گے، ہم بنو نوفل کے شرمندۂ احسان نہیں ہونا چاہتے۔ تاریخ و سیرۃ کے کسی ماخذ سے ایسی بات کا سراغ نہیں ملتا۔

اِس پس منظر میں بیعت عقبہ ثانیہ کے واقعہ پر نظر دوڑائیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عباسؓ کی تقریر کا روایت کردہ وہ حصہ جس میں انہوں نے فرمایا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان میں معزز و محترم ہیں اور ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے ہیں" خلاف حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ حاضرین یعنی گروہ انصار کو اس بات سے لاعلم قرار دینا کہ آنحضرتؐ ہاشمیوں کی بے مروتی کے باعث طائف کا سفر کر چکے ہیں اور وہاں سے بھی مایوس ہو کر بنو نوفل کی پناہ میں زندگی گزار رہے ہیں، قرین قیاس نہیں ہے۔ وہ یقیناً اس صورتِ حال سے باخبر ہوں گے، کیونکہ وہ گذشتہ دو سال سے آنحضرتؐ کے احوال و کوائف کا جائزہ لے رہے تھے۔

اسی طرح تقریر کے یہ الفاظ کہ " وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں" بظاہر حضرت عباسؓ کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کے آئینہ دار نہیں ہیں، کیونکہ ان الفاظ کے ذریعے تو انہوں نے آنحضرتؐ کے مقابلے میں انصار کو بالاتر کر دیا۔ انصار کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ آنحضرتؐ کو مدینہ میں پناہ دینے کے عوض ان سے من مانی شرائط منوا سکیں۔ اور جب وہ مدینہ پہنچیں تو وہاں ان کا ورود ایک معزز مہمان، باوقار رہنما کا نہیں بلکہ ایک پناہ گزین کا ورود ہو۔ ہمارے خیال کے مطابق اس طرح کے الفاظ سے آنحضرتؐ کی وکالت نہیں ہوتی بلکہ آپؐ کی پوزیشن کو ان سے نقصان پہنچتا ہے۔

گویا حضرت عباسؓ کی جو تقریر روایت کی جاتی ہے، راقم کے نزدیک اس کا ایک حصہ خلافِ واقعہ ہے اور دوسرا حصہ خلاف مصلحت۔ کیا اس صورت میں یہ بات حضرت عباسؓ کے محاسن میں شمار ہوگی یا معائب میں؟

دراصل جب کوئی بات واقعتہً نہ ہوئی ہو، بلکہ کسی نے وضع کی ہو تو ہزار احتیاط کے

باوجود اس میں سقم رہ جاتے ہیں اور یہی کچھ اس معاملے میں ہوا ہے۔ عباسی حکمرانوں کو خوش کرنے کے لیے ہمارے لکھنے والوں نے ان کے جدِ امجد کے دامن میں ایک خوبی ڈالنے کی کوشش کی، لیکن وہ کوشش ایسی ہے کہ خود ہی من گھڑت ہونے کی چغلی کھا رہی ہے۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ حضرت عباسؓ بیعتِ عَقَبہ ثانیہ کے وقت عقبہ میں موجود نہیں تھے، کیونکہ آخر کس بنا پر رسول اکرمؐ انہیں ساتھ لے گئے ہوں۔ اگر محافظوں یا پناہ دینے والوں کو ساتھ لے جانا مقصود تھا تو مُطعم اور اس کے بیٹے اس اعزاز کے مستحق تھے۔ اگر اپنے خاندان کے کسی فرد کی موجودگی ضروری تھی تو سیدنا علیؓ اور سیدنا حمزہؓ کو ساتھ لے جاتے۔ اگر کسی معزز پیروکار کو ساتھ لے جانا پسند فرماتے تو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، یا حضرت عثمانؓ کو ساتھ لے جاتے۔ حضرت عباسؓ نہ تو محافظوں میں سے تھے، نہ بنو ہاشم کے سربراہ تھے اور نہ ہی تا حال بحیثیت مسلمان وہ پہچانے جاتے تھے۔

سود، مرابحہ اور "مارک اپ"

جناب محمد نواز خاں صاحب - رحیم یار خاں

حکومت بنکنگ کے موجودہ نظام کے بارے میں بار بار یہ یقین دہانی کرا رہی ہے کہ اس نظام کو سود سے پاک کر دیا گیا ہے۔ پچھلے ماہ سٹیٹ بنک آف پاکستان نے اپنی سالانہ رپورٹ میں بڑے زور کے ساتھ یہ دعوٰی کیا ہے کہ ملک کے تمام کمرشل بنک بلا سود کاروبار کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ملک کے جید علماء نے جو سکوت اختیار کر رکھا ہے اس سے بھی یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ واقعی پاکستانی بنکوں میں اب سود کے بغیر کام ہو رہا ہے۔ علماء کے بعض حلقوں کی طرف سے بنکوں کی موجودہ بظاہر بلا سود کارکردگی کو غنیمت قرار دے کر عبوری عرصہ کے لیے اسے جائز قرار دے دیا گیا ہے۔

جب حکومت کی طرف سے بنکوں میں نفع و نقصان کی بنیاد پر کھاتے کھولنے کا آغاز کیا گیا تھا تو اس وقت بھی بعض دینی حلقوں نے حکومت کے اس اقدام کی پر جوش تائید کی تھی اور نفع و نقصان کے کھاتوں میں رقم جمع کرانے کو گویا "ثواب" اور "جہاد" کا درجہ دیا گیا تھا لیکن عملاً صورتِ حال جوں کی توں معلوم ہوتی ہے۔ بنکوں کا عملہ خود بنکوں کی موجودہ کارکردگی کو سودی قرار دیتا ہے۔ فرق صرف حسابی فارمولوں کا ہے۔ پہلے سود کو سود کا نام دے کر اسے "فی صدی" کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ اب اس کا نام "مارک اپ" لکھ کر ۲۴ پیسے فی ہزار یومیہ پر وصول کیا جاتا ہے۔ البتہ اس صورت میں سود در سود کی سابقہ شکل باقی نہیں رہی لیکن اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مارک اپ شرح فی صد میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب تجارتی

قرضوں پر مارک اپ ۱۵ فیصد تک وصول کیا جاتا ہے۔ قبل ازیں یہ شرح ۱۱ فی صدی ہوا کرتی تھی۔ چونکہ "فیصدی" کی شرح بیان کرنے سے اس کی سُود کے ساتھ واضح مشابہت ہوتی ہے۔ لہٰذا بڑی ذہانت سے "مارک اپ" کے وصول کرنے کا ایک نیا حسابی فارمولا ۴۲ پیسے فی ہزار فی دن کے حساب سے بنا دیا گیا ہے۔ بنک کے اعلیٰ افسران جو "مارک اپ" کے جدید نظریے سے پوری طرح واقف ہیں اُن کا دعویٰ ہے کہ "مارک اپ" سُود نہیں۔ یہ بنک کے اس سرمایہ کا متوقع نفع ہے جو وہ اپنے مدیون کو کاروباری مقاصد کے لیے شراکت کی بنیاد پر دیتا ہے۔ اس کی شرح بعض صورتوں میں گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے۔ جب مدیون کی کاروباری سرگرمیوں کے نتیجہ میں عملاً نفع زیادہ حاصل ہو تو مارک اَپ کی شرح بڑھ جاتی ہے۔ لیکن بنک بڑھتی ہوئی اس شرح کو وصول نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے مدیون کو واپس لوٹا دیتا ہے، البتہ جب منافع کی شرح گھٹ جائے تو بنک "مارک اپ" کی بجائے "مارک ڈاؤن" وصول کرتا ہے۔ یہ صورت طویل المیعاد کاروباری قرضوں کے بارے میں اختیار کی جاتی ہے۔ رہے قلیل المیعاد قرضے (RUNNING LOANS) اس پر "مارک اَپ" کی سطح یکساں رہتی ہے۔

"مارک اپ" کی سادہ سی شکل نقد اور اُدھار قیمتوں سے ملتی جلتی ہے۔ اگر آپ "کار" بازار میں نقد رقم سے خریدیں تو قیمت کم ہوگی، لیکن اگر آپ اسی کار کو اُدھار قیمت پر خرید کریں تو قیمت زیادہ ہوگی۔ اُدھار کی جتنی مدت زیادہ ہوگی، قیمت بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتی چلی جائے گی۔

"مارک اپ" کے اس جدید نظریہ کے حامیوں کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ "مارک اپ" کی موجودہ مروّجہ شکل "بیع مرابحہ" سے مشابہ ہے۔ بلکہ حقیقتاً یہ بیع مرابحہ ہی کی ایک شکل ہے۔ یعنی بنک ایک شے خود نقد رقم سے خرید کرتا ہے۔ پھر اسی شے کو اُدھار پر زیادہ قیمت لگا کر اپنے مدیون کو فروخت کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بنک مدیون کو نقد رقم دے کر اسے یہ اختیار بھی دیتا ہے کہ وہ اس رقم سے مطلوبہ شے نقد پر بنک کے نمائندہ کی حیثیت سے خود خرید کر لے۔ اس طرح مدیون بنک کی رقم سے جو شے نقد قیمت پر خرید کرتا ہے وہ گویا بنک کی ملکیت تصور ہوتی ہے۔ اب وہی شے جو بنک نے مدیون کے

ذریعے سے اُسے اپنا نمائندہ فرض کر کے خرید کی تھی - اس پر بنک " مارک اپ " لگا کر اُدھار قیمت پر مدیون کو فروخت کر دیتا ہے - یہ ساری کارروائی کاغذی ہوتی ہے - اب صورت مسئلہ یہ بنی ہے کہ :

بنک مدیون کو نقد قیمت پر کوئی شے خرید کرنے کے لیے اُسے اپنا نمائندہ فرض کر کے اسے رقم قرض دیتا ہے گویا مدیون شخص بیک وقت بنک کا نمائندہ بھی ہے اور اس کا مقروض بھی - پھر اسی مطلوبہ شے کے خرید کرنے کا خود ضرورت مند بھی - بنک مدیون سے اُدھار قیمت کی شرح " مارک اَپ " کی شکل میں پہلے طے کر کے پھر اُسے نقد رقم بطور قرض دیتا ہے - اس صورت مسئلہ کو بنکنگ بیوئل میں " بیع مرابحہ " یا " بیع موجّل " کے مشابہ قرار دے کر جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن بظاہر یہ اگر کھلا ربوٰ نہیں تو اس کے " ربیہ " ہونے میں بھی کوئی شک نہیں -

بعض علما نے اس صورتِ حال کو عارضی اور عبوری سکیم کے طور پر مباح قرار دیا ہے، ان کے استدلال کا انداز کچھ اس طرح ہے کہ چونکہ بنکنگ کا موجودہ نظام بتدریج مثالی اسلامی رنگ میں ڈھالا جاتا ہے اور یہ کام چونکہ بیک جنبشِ قلم نہیں ہو سکتا لہٰذا عبوری دَور کے لیے " مارک اپ " کی سکیم کو ربوٰ کی سکیم کے مقابلے میں غنیمت سمجھ کر گوارا کر لینا چاہیے - ہمارے ملک کا سیاسی، قانونی اور عدالتی نظام عملاً غلط اور حرام ہے، مگر قراردادِ مقاصد کے نفاذ اور ملکی دستور میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے محض تسلیم کر لینے سے ہم نے پورے عدالتی نظام کی حرمت کو گوارا کر لیا ہے - انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت اپنے مقدمات کا فیصلہ کراتے ہیں اور غلط نظامِ سیاست کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور ایک ہی حکومت کو گوارا کیے ہوئے ہیں جسے شریعت کی رُو سے جواز کا درجہ حاصل نہیں -

اس طرح بنکنگ کی موجودہ شکل کو بھی گوارا کر لیا جائے - اگر کھلے ربوٰ کے مقابلے میں " ربیہ " کا معاملہ ہو اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر ہو تو پھر اس صورت میں ربوا کو چھوڑ دیا جائے اور " ربیہ " کو قبول کر لیا جائے - یہ استثنائی اور اضطراری صورت ہو گی - اسی طرح فقہ کا ایک مشہور اصول ہے کہ ضرورت فتووں پر اثر انداز ہوتی ہے -

(الضرورة تبیح المحظورات) اور بعض ناگزیر شرائط و احوال کے تحت بہ ضرورت عارضی طور پر حرام کو مباح بھی ٹھہرایا جا سکتی ہے (جیسے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ)

اب میں چند سوالات عرض کرتا ہوں جو میرے ذہن میں اُبھر آئے ہیں:-

۱— اگر کوئی کاروباری شخص "واقعتہً" کسی خسارے سے دوچار ہو، اس کے لیے کاروبار کے ختم ہونے کا یقینی خطرہ ہو، اس نے لوگوں کے قرضے بھی ادا کرنے ہوں تو اس صورت میں اس کی عزت و آبرو اور اس کی کاروباری ساکھ کے نقصان کا اندیشہ بھی ہو۔ کاروبار کے ختم ہو جانے اور اس کے معاشی طور پر مفلوج ہو جانے کے بعد اس کے کنبہ اور خاندان کو جن پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا اور اس کے بچوں کا تعلیمی اور معاشی مستقبل جس بُری طرح متاثر ہو گا۔ اس کے پیش نظر اگر کوئی کاروباری شخص نیک نیتی کے ساتھ محض اپنے کاروباری نقصان سے بچنے، لوگوں کے قرضے ادا کرنے، اپنی آبرو کے تحفظ اور اپنے خاندان اور بچوں کو معاشی پریشانیوں سے بچانے کی خاطر مارک اپ کی موجودہ اسکیم سے فائدہ اُٹھائے تو اس میں شرعاً کیا امر مانع ہو گا؟

۲— ملک کے کمرشل بنکوں میں طویل المیعاد اور قلیل المیعاد قرضوں کے لیے "مارک اپ" کی جو شکل رائج ہے۔ کیا وہ بیع مرابحہ یا بیع موجل کی جملہ شرائط پورا کرتی ہے اور کیا وہ جائز ہے۔ جن علماء نے وقتی اور عبوری طور پر اسے غنیمت قرار دے کر گوارا کیا ہے۔ کیا ان کا موقف درست ہے؟

۳— کیا کوئی شخص کسی ضرورت سے مجبور ہو کر اپنے کاروباری خسارہ سے بچنے، اپنی آبرو کے تحفظ، لوگوں کے واجب الادا قرضوں کی ادائیگی اور اپنے بچوں کو معاشی پریشانیوں سے بچانے کے لیے "مارک اپ" کی سکیم سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں شرعاً کیا امر مانع ہے؟

میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے مختلف حضرات اس بحث اور متعلقہ سوالات پر غور کر کے اپنے غور و تحقیق کے ماحصل کو اشاعت میں لائیں۔

رسائل و مسائل

کیا آج غیر مسلم ممالک سے ہجرت لازم ہے

مولانا عبد المالک صاحب، منصورہ، لاہور

سوال: میں آپ کو ایک اہم مسئلہ پر تکلیف دے رہا ہوں اور آپ سے پوری امید کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا جواب جلد اور ضرور دیں گے۔ اس معاملہ میں آپ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی جگہ لینے والے عالم سے بھی رائے ضرور لیں گے۔

مسئلہ یہ ہے کہ میں کئی سالوں سے یہاں امریکہ میں مقیم ہوں۔ حال ہی میں میں مولانا کی تفسیر پڑھ رہا تھا۔ اس تفسیر میں سورۃ النساء کے رکوع نمبر ۱۲ اور ۱۴ میں یہ بات مجھ پر آشکارا ہوئی کہ ایک مسلمان کا ایک غیر اسلامی ملک میں رہنا حرام ہے۔ پھر سورۃ الانفال کے آخری رکوع میں بھی یہ بات واضح ہے کہ جب اسلامی مملکت موجود ہو تو ایک مسلمان کا غیر اسلامی ملک میں رہنا حرام ہے، جہاں پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے قانون کی خلاف ورزی کی جاتی ہو۔ اس بارے میں مولانا نے بھی اپنی تفسیر میں کافی کچھ لکھا ہے، لیکن ذہن میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسی بات ہے کہ پھر اتنے مسلمان غیر اسلامی ملکوں میں کیوں رہ رہے ہیں۔ ان مسلمانوں میں بڑے بڑے علماء کرام بھی شامل ہیں۔ پھر مولانا مرحوم کے صاحبزادے بھی امریکہ میں مقیم رہے ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری اس

مسئلہ میں قرآن پاک اور حدیث پاک کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں اور اگر آپ کے خیال میں یہاں پر رہنا جائز ہے اور اس بارے میں کوئی قرآنی آیت اور حدیث کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں۔

میں پاکستان کا باشندہ ہوں اور وہاں پر واپس آکر رہ بھی سکتا ہوں۔

آپ سے ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس مسئلہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے اس خط کا جواب جلد دیں گے تاکہ مجھے فیصلہ کرنے میں مزید تاخیر کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

جواب:۔ کسی غیر اسلامی ملک میں وقتی طور پر کاروبار یا ملازمت کے لیے یا دعوت و تبلیغ کے لیے رہنا جائز ہے بلکہ بعض اوقات ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی وابستگی اہلِ اسلام اور اسلامی ملک کے ساتھ ہی رکھے۔ اور مستقل شہریت بھی اسلامی ملک ہی کی رکھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت اسلامی ممالک میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہے جس وجہ سے کہا جا سکے کہ "دارالکفر سے دارالسلام کی طرف ہجرت ضروری ہے"۔

آگے چل کر اگر حالات نے تقاضا کیا کہ کافر ممالک میں پھیلے ہوئے مسلمان دارالاسلام کی طرف ہجرت کر کے آجائیں اور دنیائے کفر کا یکجا ہو کر مقابلہ کریں تو ایسے حالات میں دوبارہ ہجرت فرض ہو جائے گی، لیکن فی الحال ہجرت فرض نہیں ہے یعنی دارالکفر سے دارالمسلمین کی طرف ہجرت فرض نہیں ہے البتہ کفر و شرک اور معصیت سے اسلام اور نیکی و تقویٰ کی طرف ہجرت تو بہرحال فرض ہے۔

ہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگر دارالکفر میں ایک انسان اپنے اور اپنے اہل و عیال کے ایمان کو نہ بچا سکتا ہو تو پھر دارالکفر میں اقامت اختیار کرنے کا خطرہ مول نہ لے۔

واضح رہے کہ دارالکفر میں صحیح شعور رکھنے والے مسلمان کے لیے بنیادی وجہِ جوازِ اقامت صرف سعیِ دعوت و اصلاح ہوتی ہے۔ اس سعیِ دعوت کے جب تک دروازے بالکل بند اور

اصلاح قطعاً ناممکن نہ ہو جائے، نیز کوئی ایسا حقیقی مرکزِ اسلام وجود میں نہ آجائے، جہاں سے جہاد کی اُٹھنے والی تحریک دُنیا کے ہر مسلمان کو پکار رہے، غیر مسلم ممالک میں کام کیا جا سکتا ہے۔

کونسا فقہی مسلک

سوال: ایک استفسار پیش کر رہا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ:

۱۔ قرآن و سنّت کی روشنی میں فقہ کا مقام، مرتبہ اور اہمیت کیا ہے؟

۲۔ جماعتِ اسلامی کا فقہی مسلک کونسا ہے؟

۳۔ آپ عموماً کون سے فتاویٰ سے استفادہ کرتے ہیں؟

۴۔ اُردو دان آدمی جو ترجموں کی مدد سے قرآن و سنّت سمجھتا ہے، کیا وہ فقہ سے بے نیاز ہو سکتا ہے؟ یعنی خود ہر معاملے میں براہِ راست قرآن و سنّت سے استفادہ کر سکتا ہے؟

۵۔ فقہ سمجھنے کے لیے آپ مجھے کونسا مفصل فتاویٰ (عربی) پڑھنے کا مشورہ دیں گے؟

جواب: آپ کے سوالات کا جواب درج ذیل ہے:

فقہ کتاب و سنّت کے گہرے اور وسیع علم کا نام ہے۔ اِسی سے آپ فقہ کی اہمیت کا اندازہ کر لیں اور یہیں سے آپ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ فقہاء میں زیادہ اختلافات اس وجہ سے پائے جاتے ہیں کہ قرآن و سنّت کے گہرے اور وسیع سمندر میں جب علمی جواہر تلاش کرنے کے لیے غواصی کرتے ہیں تو ہر ایک کی رسائی اپنی استطاعت کے مطابق ہوتی ہے۔ اور غواص اس سمندر کی تہہ میں ایک ہی مقام تک پہنچنے کی بجائے مختلف مقامات پر پہنچتے ہیں اور مختلف جواہر تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے پانی کے سمندر میں غواصی کرنے والے

سمندر کی گہرائی میں بمشکل ایک مقام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اہل السنت والجماعت کے تمام فقہا اور ان سب کی فقہیں قابلِ احترام اور استفادہ ہیں۔ لیکن جماعتِ اسلامی من حیث الجماعت کسی ایک فقہ کی علم بردار نہیں ہے۔ اسی لیے کہ وہ تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر اسلامی نظام قائم کرنا چاہتی ہے اور اسلامی نظام کسی ایک فقہ میں محدود نہیں ہے۔

البتہ جماعتِ اسلامی میں ایسے علما کی تعداد بھی خاصی ہے جو فقہ حنفی پر عامل ہیں اور وہ فقہ حنفی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ فقہ سے تو کوئی بھی بے نیاز نہیں ہے، نہ عام آدمی اور نہ خاص، تمام لوگ اس کے محتاج ہیں۔

حنفی فقہ کو سمجھنے کے لیے آپ مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی "علم الفقہ"، مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی "تعلیم الاسلام"، مولانا اشرف علی تھانوی کی "بہشتی زیور"، مولانا محمد یوسف اصلاحی کی "آسان فقہ" کا مطالعہ کریں۔ عربی کتب کی طرف بعد میں متوجہ ہوں۔

فقہی مسائل میں ایک خاص توسع پسندانہ انداز مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ مولانا حالات کا پورا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور پھر استدلال سے اس کا حکم شریعت سے اس طرح اخذ کرتے ہیں کہ اسلاف کے نقوش سے رُوگردانی نہیں کرتے۔ اور مولینا تمام علما و ائمہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ مولینا نے فتویٰ تو کبھی نہیں لکھا، لیکن مسائل و مباحث کے جواب لکھے ہیں، رسائل و مسائل نامی کتاب کے کئی حصوں میں جمع ہیں، نیز تفہیم القرآن کے نوٹس میں بھی فقہی بحثیں بہت ملیں گی۔

وفیات

دل میں ہیں جس قدر بھی داغِ اَلم
جانے والوں کے ہیں نشانِ قدم

(۱)

سید احمد عروج قادری ایڈیٹر زندگی نئی دہلی زندگی کی دوڑ میں آگے نکل گئے۔ تحریکِ اسلامی کے محاذِ قلم کا ایک مجاہد جدا ہو گیا۔ تاریخ وفات ۱۷ مئی ۱۹۸۶ء مطابق ۷ رمضان المبارک بروز سنیچر، چار بجے صبح، بمقام بریلی ہسپتال، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

۲۴ مارچ ۱۹۱۳ء کو ضلع اورنگ آباد (بہار) کے ایک اسلامی خانوادے آستانۂ عالیہ امجھر شریف میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان شروع سے اسلامی رجحانات کی روشنی سے بہرہ مند تھا۔

قادری صاحب کی ابتدائی تعلیم امجھر شریف، پھر مدرسۂ محمدیہ پٹنہ اور شمس الہدیٰ پٹنہ میں ہوئی۔ فاضل کی سند حاصل کی۔ اسلامی علوم کی تدریسی خدمت سے پہلے مدرسۂ عزیزیہ بہار، پھر مدرسۂ شمس الہدیٰ میں ۴۵–۱۹۵۳ء تک انجام دی اور اس کے بعد جماعت کی ثانوی درس گاہ رام پور میں آگئے۔ ۴۶ء میں جماعت کے رکن بنے۔

پچھلے دور میں جماعت کی تربیتی سرگرمیوں میں، جلسوں اور جلوسوں میں، شوریٰ کے اجتماعات میں، کبھی قائم مقام امیر کی حیثیت سے، کبھی رکنِ شوریٰ کی حیثیت سے اور کبھی مدیر زندگی کی حیثیت سے بڑے اعلیٰ اور وسیع فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۹۶۰ء سے ماہنامہ زندگی کی ادارت کا بار اٹھایا اور تادمِ آخر اسے

حُسن و خوبی سے نبھایا۔ رسالے کے تمام عنوانات کے تحت لکھا اور تمام ضروریات کو پُورا کیا۔ مطالعہ وسیع رکھا، لہٰذا تحریروں میں گہرائی بھی تھی اور گیرائی بھی۔

مُسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبر بھی رہے اور مسلم مجلسِ مشاورت کی رکنیت کا حق بھی ادا کیا۔ ۱۶ کے قریب کتابیں لکھیں۔ خدا نے حج و زیارت سے بہرہ مند کیا۔

درس کی خاص اثر انگیز صلاحیت تھی۔ چلتے چلتے سُننے والے لوگ رُک جاتے اور متاثر ہوتے۔

اسلامی ادب کے میدان میں نکلے تو شاعری کا پرچم بلند کیا۔ اور "سمت سفر"، "تحفۂ زنداں" اور "فیضِ کعبہ" کے ناموں سے تین مجموعہ ہائے کلام بھی پیش کر دیئے۔

اللہ ایسی نُورانی شخصیتوں پر خصوصی رحمتیں اور بخششیں نازل فرماتے۔ اور خاندانی اور جماعتی پس ماندگان کو صبر کے ساتھ اس غم کے بالمقابل خصوصی انعامات و فیضان سے بھی نوازے۔

---

(۲)

بھارت کے مشہور دانش ور، محبت کیش، سنجیدہ اور جرأت مند صحافی مسلم صاحب (ایڈیٹر دعوت دہلی) ۳ جولائی کو دن کے ۱/۲ ۳ بجے انتقال فرما گئے۔

علالت کا سلسلہ عرصہ سے چل رہا تھا۔ میں جب ۱۹۸۴ء میں امریکہ گیا تو مسلم صاحب بھی تشریف لے گئے اور ملاقات رہی۔ ان کے سفر کا ایک بڑا مقصد علاج معالجہ ہی تھا۔ ۳ جولائی کی صبح کو اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی، انہیں پنت ہسپتال میں لے جایا جا رہا تھا۔ راستے ہی میں سے اُن کے مسافر زندگی نے اپنا خاص راستہ اختیار کر لیا۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ!

مغرب سے کچھ قبل جنازہ جامع مسجد میں لے جایا گیا۔ جماعت

کے رہنماؤں اور کارکنوں کے علاوہ دلی کی بہت سی نمایاں شخصیتیں موجود تھیں۔ جنازہ کی نماز امیر جماعت اسلامی ہند مولینا ابواللیث اصلاحی کی امامت میں ادا ہوئی۔

مسلم صاحب طویل مدت تک مجلسِ شوریٰ کے رکن بھی رہے اور اعلیٰ سطح کے فیصلوں میں برابر شرکت فرماتے رہے۔ مسلم صاحب نے اخبار دعوت کی ذمہ داری کا حق ادا کرکے بڑا کام کیا۔ جماعتِ اسلامی اور اس کی پالیسیوں کو نمایاں کرتے رہے۔ جماعت کے نظریات و بیانات کو مسخ کرنے والے متعصب اخبارات کا مقابلہ کرتے رہے، مشکل ماحول میں پیغامِ حق سنایا۔ غیر اسلامی فضا میں اسلامی صحافت کا نیا نہج پیدا کیا، فرقہ وارانہ آویزشوں کے درمیان عدل و حکمت کے اُصولوں کے تحت حقائق پر غور کرنا سکھایا، انہوں نے حکومت اور متعصب اکثریت کے مغالطوں اور فکری غلطیوں کا بھی توڑ کیا، لیکن نہ خود کوئی بے جا خم کھایا، نہ مسلمانوں کی مجموعی عزت و عظمت میں فرق آنے دیا۔ ۳۰ سال مسلسل یہ عظیم خدمت جاری رہی۔

ان کی شخصیت میں محبت کا ایک سرچشمہ ایسا تھا جو دوست دشمن سب کے لیے جاری رہتا اور اس کی وجہ سے ان کو مختلف حلقوں میں غیر معمولی اثر و نفوذ حاصل تھا۔ وہ کل ہند مجلسِ مشاورت کے بانیوں میں سے تھے اور اس کے لیے مختلف الخیال حلقوں کے لوگوں کو جوڑنے کے لیے بڑی محنت کرتے تھے۔ ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کی کوئی راہ نکلے، وہ اس کے لیے جذبۂ خاص رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اُن کے ایمان و اخلاق اور خدمات کو قبول فرما کر انہیں آخرت میں بہترین مقامِ رحمت عطا فرمائے۔ ان کے لواحقین میں دعوتِ حق اور

خدمتِ دین کا سلسلہ مزید فروغ پائے اور جماعت کے رفیقوں کو ان کی خالی کردہ جگہ کے لیے بہترین صلاحیتوں سے آراستہ کوئی ہستی عطا فرمائے۔ آمین۔

---

(۳)

اِدھر ایک صدمہ میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی پاکستان کو پیش آیا کہ اُن کے والدِ مکرم میاں برکت علی صاحب کا انتقال ۲۲ جولائی کو ۸ بجے بعدِ مغرب ہوا۔ عمر ۹۴ سال تھی۔ (سال پیدائش ۱۸۹۲ء) وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

مرحوم سات بھائیوں میں سے دوسرے نمبر پر تھے۔ ایس۔ وی کیا اور رائے پور دانیاں (ریاست کپور تھلہ) میں ہیڈ ماسٹر رہے۔

ساری عمر دوسرے کے لیے جیے، کسی کا دکھ درد برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی کوئی جائداد نہیں بنائی۔ زائد آمدنی دوسروں پر خرچ کر دیتے۔ اپنی اولاد میں سے خاص طور پر میاں طفیل محمد صاحب کی تعلیم پر خاصا خرچ کیا۔ میاں صاحب نے ایل۔ ایل بی کر کے وکالت شروع کی ہی تھی کہ جماعتِ اسلامی کی دعوت پر لبیک کہی اور مولینا سید مودودیؒ کے قافلے میں شامل ہوگئے۔ والد صاحب نے چاہا کہ وکالت بھی ساتھ ساتھ چلتی رہے، مگر یہ ممکن نہ ہوا تو پھر میاں طفیل محمد صاحب کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لی۔ جماعت کا سارا لٹریچر پڑھا، "ترجمان القرآن" اور "ایشیا" کا مطالعہ مسلسل جاری رہا۔

تشکیل پاکستان کے وقت کپور تھلہ سے ہجرت کر کے ضلع فیصل آباد میں سمندری روڈ، ڈجکوٹ چھرا چک نمبر ۲۰۵ آر، بی میں آباد ہوئے۔

آخر وقت تک چلتے پھرتے اور مسجد میں نمازیں پڑھتے تھے، مگر حافظے میں فرق آگیا تھا۔ اور پوچھتے تھے کہ کیا میں نے نماز پڑھ لی ہے۔ بعض اوقات ایک ایک نماز کئی کئی ادا کرتے۔

چند برس سے عبادات، ذکر و اذکار اور نوافل کی طرف خاص توجہ تھی۔ تہجد اور اشراق کا بھی اہتمام تھا۔

اللہ تعالیٰ بخشش سے نوازے، اور کمزوریوں سے درگذر کرے اور سارے خاندان پر رحم و کرم فرمائے۔

مولینا فتح محمد صاحب امیر صوبہ پنجاب کے بہنوئی اور چوہدری محمود احمد صاحب سابق قیم صوبہ پنجاب کے والد کی فوتیدگی پر بھی ادارہ جذبۂ شرکتِ غم کے ساتھ مرحومین کی مغفرت کے لیے دست بدعا ہے۔

اعتذار

رسالہ کی کتابت مکمل ہونے کے بعد ترتیب کی صورت ایسی بنی کہ مطبوعات کے لکھے لکھائے صفحات روک لینے پڑے۔ ادارہ متعلقہ حضرات سے معذرت خواہ ہے۔

دسمبر ۱۹۸۶ء

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

مسافرانِ عدم

کی

درخشاں زندگیاں ○ روشن راستے

- ○ اسلامی تحریکِ زندگی کی ظلمات کو روشن کرتی ہے۔
- ○ اسلامی تحریک کے علمبردار لوگ تاریخ کے راست رو مسافر ہوتے ہیں۔
- ○ ایسے مسافروں کی زندگیاں روشن ستاروں کی مانند ہوتی ہیں۔
- ○ بھٹکے ہوئے مسافروں کے لیے رہنمائی کا سامان
- ○ ہر زندگی، ایک پیغامِ زندگی
- ○ نمونے کی ان زندگیوں میں صالح زندگی کے بے شمار نمونے
- ○ سُست رو مسافروں کے لیے تیز روی اور تیز گامی کا پیغام

پیغامِ زندگی کی حامل کتاب:

مُسافرانِ عدم

تحریکِ اسلامی کے مرحوم رہنماؤں کی زندگیوں کے تحریکی خاکے جن میں ان کی تحریکی زندگی کا نچوڑ آگیا ہے۔

اسعد گیلانی کے جذبہ انگیز قلم سے

صفحات ۵۰۰ ○ سائز $\frac{۲۳ \times ۳۶}{۱۶}$ ○ زیرِ طبع

چند نام درج ذیل ہیں

- مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
- مولانا مسعود عالم ندوی
- چودھری علی احمد خاں
- چودھری غلام محمد
- مولانا جان محمد بھٹو
- خان سردار علی خان
- نصراللہ خان عزیز
- مولانا عبدالعزیز
- خان محمد باقر خان
- صدیق الحسن گیلانی
- ڈاکٹر نذیر احمد شہید
- الٰہ بخش شہید
- حمیدہ بیگم
- عبدالمالک شہید

**

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار۔ لاہور